قزاقستان، ترکستان اور ازبکستان کے بعض خطوں کی سفری داستان

تیمُور و بَابر کی دھرتی کی سیر

سَیر بین

محمد افروز قادری چریاکوٹی

رفاعی مشن، نئی ممبئی، انڈیا

قَزاقستان، تُرکستان اور اُزبکستان کے بعض خطوں کی سفری داستان

تیمور و بابر کی دھرتی کی سیر

ایک عبرت زا اور تاریخی سفرنامہ

از قلم

محمد افروز قادری چریاکوٹی

بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ ﷺ

تفصیلات

کتاب : تیمور و بابر کی دھرتی کی سیر

ترتیب: محمد افروز قادری چریاکوٹی غفرلہٗ
afrozqadri@gmail.com

غایت : ''دیکھا ہے جو کچھ میں نے اَوروں کو بھی دکھلادوں''

تقریظ : مفکر اسلام، پیر طریقت علامہ محمد عبد المبین نعمانی قادری مدظلہ العالی

تحریک : محبِ گرامی قدر، مفتی دیارِ کوکن علامہ سید رضوان احمد رفاعی شافعی

صفحات : 104 (ایک سو چار)

اِشاعت : رجب المرجب ۱۴۴۵ھ ------- جنوری 2024ء

ISBN : 978-93-5980-506-1

پبلشر : رفاعی مشن، کھیرنا گاؤں، نئی ممبئی

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا وَتُبْ عَلَيْنَا وَلَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

فہرستِ مضامین

عرضِ حال

سفر ناموں کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود سفر۔ سفر کے نتیجے ہی میں سفر نامے وجود میں آئے۔ کبھی یہ محض حافظے کی زینت رہا کرتے تھے؛ مگر آج اسے رنگِ تحریر دے کر ہر ایک کے لیے اِستفادے کی میز پر سجا دیا جاتا ہے کہ اگر کسی کی قسمت یاوری نہ کرے اور وہ دنیا جہان کے ان مقامات پر نہ بھی پہنچ سکے تو کم از کم چشمِ تصور کے سہارے وہ خود کو ان مناظر و مرایا سے محظوظ و مسرور ہی کرالے۔

'سفر وسیلۂ ظفر' صحیح معنوں میں اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ 'مسافر' اپنے سفر میں دوسروں کو بھی شریک کرے۔ اور سفر میں دوسروں کو شریک کرنے کی ایک امکانی صورت یہ بھی ہے کہ تمام تجربات و مشاہدات کو اس طرح بیان کردیا جائے کہ سفر نامہ پڑھنے والا ذہنی طور پر انھیں راستوں اور گزرگاہوں پر خود کو گام فرما پائے۔

'سفرنامہ' علمی و ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ واحد صنف ادب ہے جس کا تقریباً تمام اہم معاشرتی علوم سے گہرا تعلق ہے۔ مؤرخوں، سوانح نگاروں اور جغرافیہ دانوں نے اس صنف سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے، اور اسی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی چھوٹی زبانوں کے اَدبیات میں سفر ناموں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اَدبیات و تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں پر عیاں ہوگا کہ تحریری شکل میں اوّلین سفر نامہ غالباً ابن جبیر (م۶۱۴ھ) کے قلم سے معرضِ وجود میں آیا، بلکہ حاجی خلیفہ کی تحقیق سے باور ہوتا ہے کہ مجاہد یورپ ابن رشد (م۵۹۵ھ) نے سب سے پہلے اپنا سفر نامہ مرتب کیا تھا۔ پھر سفر نامے کا یہ سلسلہ عہد بہ عہد چلتا ہوا ابن بطوطہ (م۷۷۹ھ) کی دہلیز تک پہنچا جس کی نیرنگیِ فکر اور جودتِ طبع نے اسے مستقل ایک فن

بنا دیا؛ اس لیے اہل علم و ادب نے رحلہ ابن بطوطہ مسمّٰی بہ تحفة الأنظار في غرائب الأمصار و عجائب الأسفار کو اپنے موضوع پر ایک شاہکار اِنسا ئیکلوپیڈیا اور عہد آفریں کارنامہ قرار دیا ہے۔

تاریخ نے اپنے دامن میں بہت سے سفرنامے محفوظ کر رکھے ہیں جن میں بعض مشہور رحلات یہ ہیں : رحلۃ ابن رشد (م۵۹۵ھ) ، رحلۃ ابن جبیر (م۶۱۴ھ) ، رحلۃ ابن الصلاح (م۶۴۳ھ) ، رحلۃ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) ، رحلۃ بدرالدین (م ۹۸۴ھ) ، رحلۃ الدرعی (م۱۱۲۹ھ) ، رحلۃ العیاشی (م۱۱۴۹ھ) ، رحلۃ الزبادی (م۱۲۰۹ھ) وغیرہ۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ ہر دور میں اہلِ علم نے سفرناموں سے خصوصی اِعتنا برتا ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانے کا مؤمنانہ فریضہ انجام دیا ہے۔ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں اولیاے کرام اور صوفیۂ عظام کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ منازلِ سلوک طے کرنے کے لیے 'سفر' اختیار کیا کرتے تھے اور اس سفر میں وہ دیگر برکاتِ روحانی کے علاوہ اکابر اولیا کی صحبتوں سے بھی فیض یاب ہوتے، اور صلحاے اُمت کے مزارات سے بھی اکتسابِ رنگ و نور کرتے تھے۔

ہماری درخشندہ اسلامی تاریخ ایسے صوفیۂ صافیہ کے وجودِ باجود سے مالامال ہے۔ بر سبیلِ مثال سلطان الہند خواجہ معین الدین سجزی اجمیری، مخدوم جہانیان جہاں گشت بخاری، حضرت داتا گنج بخش عثمان ہجویری، اور خواجہ غوث علی شاہ قلندر پانی پتی علیہم الرحمۃ والرضوان وغیرہم کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

یوں ہی اکابر اولیا و صلحا کے حالات و معمولات میں 'رحلہ' (سفر) ایک باقاعدہ باب رہا ہے۔ کتبِ تصوف اس حقیقت پر شہادتِ عدل قائم کرتی ہیں۔ سمندر کی لہروں سے لڑنا، ہولناک ریگستانوں سے گزرنا، پرشور دریاؤں کو کھنگالنا، فلک رفعت پہاڑوں پر چڑھنا، جنگلوں اور بیابانوں کو عبور کرنا اور برفستانوں کو قطع کرنا آسان کام نہیں۔ ہمارے

دور میں بھی بعض اہل علم نے اہل اللہ کی اس سنت و روش کو زندۂ جاوید کرنے کے لیے مختلف بلاد و اَمصار کا سفر اختیار کیا ہے، اور اس کی برکتوں سے اہل اسلام کے مشامِ جاں کو مہکانا چاہا ہے۔

یہ وہ خوش بخت ہوتے ہیں جن کی زندگی 'ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن' کی تفسیر ہوتی ہے۔ وہ ہمہ دم رواں دواں رہتے ہیں؛ تاکہ حیاتِ جاوداں پا سکیں۔ وہ ہمیشہ نئے آفاق کی تسخیر میں جٹے ہوتے ہیں، اور قومِ مسلم کے بازوؤں کو قوتِ پرواز عطا کرنے کے لیے روشن اِمکانات کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

یوں تو فقیر قادری نے زندگی میں کئی ملکوں کے بہت سے علمی، تعلیمی، تاریخی، اور دعوتی اسفار کیے؛ مگر ان کے احوال و آثار کو چن کر سلکِ تحریر میں پرونے کا کبھی خیال نہ آیا؛ لیکن ۲۰۲۴ء کے آغاز پر جب ہم نے مشرقِ وسطی کے بعض اہم خطوں کی طرف شد رحال کیا تو کچھ احباب نے رودادِ سفر کو حیطۂ تحریر میں لانے کی پُرزور فرمائش کی؛ اس لیے ''خیالِ خاطرِ احباب'' کے پیش نظر ایک مختصر سی سفری داستان سپردِ قرطاس کر دی، اور ارادہ تھا کہ اسے فیس بک پر شیئر کر دیں گے؛ لیکن جب اپنی دیگر تحریروں کی طرح اس سفر نامے کو حضور داعیِ اسلام قبلہ علامہ محمد عبدالمبین نعمانی دامت فیوضھم کی بارگاہ میں برائے تصحیح پیش کیا تو آپ نے نہ صرف اس کی تحسین فرمائی بلکہ چند صفحات کا ایک جامع مقدمہ بھی ارتجالاً تحریر فرما دیا؛ اس لیے اب اس سفر نامے کو مرحلۂ طباعت سے گزارنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ بچا!۔

چنانچہ ہم نے پہلی فرصت میں اسے کتابی شکل دی، قبلہ حضور کے کلماتِ تقریظ کو سفرنامے کے ماتھے کا جھومر بنایا اور پھر جیسے تیسے کتاب پریس کے حوالے کر دی۔ یعنی کل اٹھارہ بیس دن کے اندر بارہ روزہ سفر بھی ہوا، رودادِ سفر بھی بنی اور پھر طبع ہو کر قارئین کے روبرو آ گئی۔ ربنا تقبل منا ولا تؤاخذنا إن نسينا أو اخطأنا۔

بابر کی یادگار تار تار: یہاں ایک عجیب بات کا ذکر کر دینا بھی قارئین با تمکین کے لیے نامناسب نہ ہوگا کہ جس وقت سفر نامہ **''تیمور و بابر کی دھرتی کی سیر''** کی آخری سطریں سینۂ قرطاس پہ اُبھر رہی تھیں، اور بابر کے دیار کا تذکرہ مکمل ہو رہا تھا، ٹھیک اسی وقت یہاں ہندستان میں ایودھیا کے اندر ۲۲ ؍ جنوری ۲۰۲۴ء کو **''بابری مسجد''** کی جگہ غیر قانونی طور پر بنائی گئی رام مندر کا افتتاح اور اُدھ گھاٹن ہو رہا تھا۔

یہ مسجد ہندِستان میں مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کی ایک تاریخی یادگار تھی، جس کی اس نے ۱۵۲۷ء کو اپنے ایک معتمدِ خاص میر باقی کے ذریعہ تعمیر کروائی تھی۔ حقائق و شواہد بتاتے ہیں کہ اس مسجد کی بنا تقوی وللّٰہیت کے اوپر رکھی گئی تھی، کسی مندر کے ملبے پر اسے ہر گز تعمیر نہیں کیا گیا تھا؛ لیکن عدلیہ کی ناانصافی، آر ایس ایس کی من مانی اور قانون پر حکومت کی اجارہ داری کے باعث یہ مسجد بھگوائیوں کے تشدد کی بھینٹ چڑھ گئی، اور پھر مسجد کے ملبے پر دھڑلے سے مندر اٹھا دیا گیا، جس کی پوری دنیا گواہ ہے۔

خیر! یہاں کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ رام مندر کے افتتاح کے دن کچھ ایسا جشن منایا گیا اور ایسی ہوا چلائی گئی کہ مانو ہندِستان اب ہندو راشٹر بن گیا ہے اور مسلمانوں کی اَب خیر نہیں؛ لیکن اللہ کی شان دیکھیں کہ ٹھیک دو دن کے بعد ''سورَج کُمار'' نامی ایک شخص فقیرِ قادری کے ہاتھ پر کلمہ پڑھ کر ''محمد شمس'' بن رہا تھا۔ گویا رام مندر کی فصیلوں سے اذان دینے والے مجاہدین کا کاروانِ شوق بھی تیار ہونے لگا۔ شر سے خیر نکالنے کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے!، بے شک میرے رب کی قدرت عظیم و جلیل اور اس کی حکمت سب پر غالب و فائق ہے۔ خدا کرے نا انصافیوں کا سورج جلد غروب ہو اور غلبۂ اسلام کا سویرا جلد طلوع ہو۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

محمد افروز قادری چریاکوٹی

۲۴ ؍ جنوری ۲۰۲۴ء ۔۔۔ ۱۲ ؍ رجب المرجب ۱۴۴۵ھ بروز چہار شنبہ

داعیِ اسلام، خیر الاتقیاء حضرت علامہ مفتی **محمد عبد المبین نعمانی** قادری دامت فیوضہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلي ونسلم علی رسولہ الکریم

و علیٰ آلہ وصحبہٖ اجمعین۔ وبعد!

"**تیمور و بابر کی دھرتی کی سیر**" عزیزی مولانا محمد افروز قادری چریاکوٹی کے ایک سفر کی روداد ہے۔ بظاہر یہ سفر تیمور و بابر کی دھرتی کا ہے؛ مگر اصلاً یہ مراکزِ علم و فضل کا سفر ہے، جہاں سے روحانیت کے بھی سوتے پھوٹتے ہیں، افسوس کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ بالعموم ان دیار و مراکز سے نابلد ہے۔ مولانا محمد افروز قادری نے ان خطہ ہائے علم و فن کا صرف سفر ہی نہیں کیا بلکہ احباب و شائقین کی ضیافت کے لیے اس سفر کی تفصیلات کو بھی حیطۂ تحریر میں لے آئے ہیں۔ یہ کوشش بصد لائقِ تحسین و تبریک ہے اور ہمارے لیے معلومات کا خزانہ بھی۔

سفر تو بہت لوگ کرتے ہیں؛ لیکن سفر کی یادداشتوں کو قلم بند کرنا اور انہیں سجا بنا کر پیش کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ بہت سے لوگ صرف یادداشت جمع کرتے

ہیں؛ لیکن مولانا نے یہاں اپنی رودادِ سفر کچھ اس طرح صفحاتِ قرطاس پر بکھیری ہے کہ پڑھنے والا پڑھتا جاتا ہے اور تصور ہی تصور میں ان مقامات کی گویا خود سیر بھی کرتا جاتا ہے۔

مولانا کو خداے بخشندہ نے مؤمنانہ بصیرت سے نوازا ہے۔ انھوں نے دورانِ سفر ہر مقام کو ایک مردِ مومن کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان مقامات کو جن کو لوگ عموماً ظاہری آنکھ سے دیکھ کر ان کا حال لکھ دیتے ہیں مولانا موصوف نے اپنے نورِ فراست سے ان کے باطن میں بھی جھانکا ہے اور اس کا حال بھی زینتِ قرطاس کردیا ہے۔

مقامات و ملاقات کی منظر کشی کچھ ایسی ہے کہ قاری پڑھتا ہے تو پڑھتا ہی چلا جاتا ہے، اکتاہٹ کا نام بھی نہیں لیتا۔ حیرت ہے کہ خطۂ سمرقند و بخارا اور طاشقند وہ علاقے ہیں جو عرصۂ دراز تک روسی سلطنت کے زیر نگیں تھے، زبان بھی غیر مانوس ہے۔ آزادی کے بعد بھی یہاں نہ اُردو آئی، نہ فارسی اور نہ عربی، انگریزی بولنے والے بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ایسے علاقوں کے سیر و سفر سے کچھ حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہیں؛ لیکن دلدادۂ قرطاس و قلم مولانا محمد افروز قادری نے اپنے اس سفرنامے کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

یہ سفرنامہ میری نظر میں کسی اَدب پارے سے کم نہیں۔ اس کو پڑھیے تو ایسا لگتا ہے کہ جگر کے ٹکڑے صفحاتِ قرطاس کی نذر کردیے گئے ہیں، گویا حسین الفاظ اور خوبصورت جملوں کا یہ ایک دلفریب گلدستہ ہے، اور کیوں نہ ہو کہ اس میں ادبی صلاحیت کے ساتھ حسنِ عقیدت کی کارفرمائی بھی اپنا رنگ و آہنگ دکھا رہی ہے۔

میری رائے ہے کہ یہ معلومات افزا سفر نامہ کسی روزنامے کی زینت بنے؛ تاکہ عام قارئین تک بھی اس کی افادیت اپنا اثر دکھائے، اور قلم کار کی محنت کام میں آئے۔ خود میں نے اسے پڑھا تو پڑھتا چلا گیا اور ایک دو نشست میں ختم کر ڈالا۔ جب کہ کسی مسودے کے ساتھ بہت کم ایسا ہوتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

سفر نامے اور ڈائری لکھنے کے کئی مقاصد ہوتے ہیں:

اوّل یہ کہ محض سفر کی روداد منضبط کرنا۔

دوم تاریخی مقامات کی سیر کرنا اور قاری کو کرانا۔

سوم اپنی انشا پردازی کے جوہر دکھانا۔

چہارم کسی علاقے کی شخصیات کا تعارف پیش کرنا۔

پنجم علاقے آبادی اور وہاں بسنے والوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالنا، مثلاً زمین، پیڑ پودوں، جنگلوں، پہاڑوں اور وہاں کی پیداوار کے بارے میں معلومات بہم پہنچانا اور دوسروں کو وہاں کی سیاحت کا شوق دلانا وغیرہ۔

ششم کسی جگہ کے اولیاء اللہ۔ فقہا، محدثین، مورخین، فنکار اور زبان و قلم کے دھنی افراد کا تعارف حاصل کرنا اور انھیں قاعدے سلیقے سے محفوظ کرنا۔

ہفتم زیر زمین اصحابِ فکر و فن اور اربابِ زہد و تقویٰ کی سوانح حیات اور کردار و خدمات کو منظر عام پر لانا وغیرہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں، سب کا احاطہ کرنا کارے دارد۔

علمائے کرام نے بھی بہت سے یادگار سفر نامے چھوڑے ہیں، چند کے نام یہ ہیں؛ ا: **حج کی ڈائری**۔ از: مولانا ابوالنور محمد بشیر کوٹلوی مصنف واعظ۔

۲ : **سفرنامۂ حج**۔ از : مولانا غلام مصطفیٰ کوثر امجدی بلیاوی۔ ۳ : **سفرنامۂ حج وزیارت بنام زیاراتِ مقدسہ**۔ از : مولانا مفتی عبدالواجد امین شریعت ادارہ شرعیہ بہار۔ ۴ : **سفرنامۂ حجاز**۔ از : حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی۔ ۵ : **جادہ ومنزل**۔ از : مولانا بدر القادری مصباحی۔ ٦ : **سفرنامۂ ایران**۔ از : مولانا سید محامد اشرف جیلانی میاں اشرفی کچھوچھوی۔ ۷ : **ایک سفر دہلی سے سہارن پور تک**۔ از : رئیس القلم علامہ ارشد القادری۔ ۸ : **سفر ہے شرط**۔ از : امین ملت ڈاکٹر سید محمد امین میاں برکاتی مارہروی۔ ۹،۱۰ : **امام بخاری کے ملک میں چند روز**۔ اور۔ **مشاہدات**۔ ہر دو از : مولانا ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین۔

یہ چند سفرنامے جو باضابطہ طبع شدہ ہیں اور ان کا تعلق علما ومشائخِ حال سے ہے، بہت سے سفرنامے مضامین کی شکل میں چھپے، کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آئے، ان میں جناب زبیر احمد قادری ممبئی کا سفرنامہ رودادِ پاکستان جس کی چند قسطیں سہ ماہی افکارِ رضا بمبئی میں شائع ہوئیں۔

دوسرا سفرنامہ مولانا ڈاکٹر مفتی امجد رضا امجد رضوی چیف قاضی ادارہ شرعیہ پٹنہ بہار کا ہے جس کا عنوان ہے : وادیِ نور کا سفر، جو رفاقت اور رضا بک ریویو پٹنہ میں چھپا؛ لیکن علاحدہ سے اس کی مستقل اشاعت نظر سے نہیں گزری۔ ایک دو قسطوں پر مشتمل سفرناموں کی تعداد تو بہت ہے جن کا احاطہ مشکل ہے، اور بروقت یہ میرا مقصود بھی نہیں۔

یہ سارے سفرنامے علما ومشائخ اور مذہبی شخصیات کے ہیں۔ استقصا کے بعد اور بھی بہت سے سفرنامے سامنے آئیں گے، یہ تو محض یادداشت کی بنیاد پر میں نے لکھ دیے ہیں۔

زیر نظر سفرنامہ ''تیمور و بابر کی دھرتی کی سیر'' ایسا لگتا ہے بادشاہوں اور حکمرانوں سے متعلق سفری معلومات پر مشتمل ہے؛ لیکن مطالعے کے بعد قاری بخوبی اندازہ لگالے گا کہ اس میں حکمرانوں کے مختصر تذکرے ضرور ہیں؛ لیکن اصلاً یہ سفرنامہ مشرقِ وسطیٰ کے چند ان مقاماتِ خیر سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے جہاں اربابِ روحانیت، محدثین، فقہا، مورخین، اوراصحابِ علم وفن استراحت گزیں ہیں اورانھیں کی زمینوں کے ذکرِ خیر سے یہ مملو ہے۔

اس سفرنامے کے خلاصے کے طور پر اگر میں یہ کہوں تو بے جا اور غیر موزوں نہ ہوگا کہ :

- اس میں عبرت کے بہت سارے نمونے ہیں۔
- تاریخی مقامات کی سیر بھی ہے۔
- خاص طور سے سلسلۂ نقشبندیہ کے بعض اساطین کے حال احوال بھی ہیں۔
- موجودہ علما و مشائخ سے ملاقاتوں کا حال بھی پایا جاتا ہے۔
- زیر زمین مدفون فقہا و محدثین کا بھی تذکرہ ہے، جو اپنی قبروں سے روحانیت کی سوغات بانٹ رہے ہیں۔
- مولانا نے اس غیر مانوس آبادی میں زبان کی اجنبیت کے باوجود جو کچھ بھی دیکھا لکھا وہ انھیں کا حصہ ہے۔ جو اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آدمی پڑھا لکھا ہو تو کہیں بھی اجنبی نہیں رہتا، ''لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا'' کی مثال صادق آجاتی ہے۔
- اس خطے بلکہ خطوں کی تہذیب وثقافت، رسم ورواج، کھانا پینا اور کھلانا پلانا یعنی ضیافت کیسی تھی اس کی چشم کشا بساطیں بھی الٹ دی ہیں اور ان کے اخلاق

وکردار کے نمایاں پہلوؤں کو بھی اجاگر کردیا ہے۔ کسی نادیدہ مسافر کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے اور اس کی اجنبیت کو انسیت میں کیسے تبدیل کیا جاتا ہے اس کی بھی کئی مثالیں آپ کو اس سفر نامے میں جا بہ جا نظر آئیں گی۔

- عام قسم کا آدمی بعض حالات ایسے بھی آتے ہیں کہ اس میں ہمت ہار جاتا ہے، اور اپنے سفر کی بساط بہت جلد لپیٹ کر واپسی کی ٹھان لیتا ہے؛ لیکن اس سفر نامے کے قلم کار اور ان اجنبی مقامات کے سیاح حضرت مولانا محمد افروز قادری کہیں بھی ہمت ہارتے نظر نہیں آتے۔ یہ ان کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کی واضح دلیل ہے، اور دوسروں کے لیے درسِ ہمت افزا بھی۔

- مولانا نے سفر سے واپسی کے بعد چند ہی روز میں اپنی یادداشتوں کو بڑے حسین پیرایے میں قلم بند کردیا جو ان کے قلم کی جولانی، قوتِ حافظہ، زود نویسی اور حوصلے کی بلندی کی غماز ہے۔ اور دوسرے کوتاہ فکر، کسل منداور سست رفتار افراد کے لیے درسِ عبرت بھی۔

- کچھ لوگ صرف سوچتے ہیں اور سوچتے ہی رہ جاتے ہیں، مولانا موصوف سوچنے کے بعد بک ٹٹ میدانِ عمل میں بھاگتے چلے جاتے ہیں اور بہت جلد میدان سر کرلیتے ہیں۔

- مصنفِ فکرافروز' مولانا محمد افروز کی تصنیفی خدمات آج کے کسلان صفت علما کے لیے مہمیز کا کام کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

- سمرقند و بخارا کی سیر کرانے والے زود رقم مولانا محمد افروز قادری قلم کے دھنی ہیں اور بالیدہ فکر بھی۔ آپ صرف لکھتے ہی نہیں ہیں، فکروفن کا جادو بھی جگاتے

ہیں۔ آپ الفاظ کے دروبست سے بھی واقف ہیں اور چمن کی حنا بندی کے بھی ماہر ہیں۔

- مولانا سخن سنج بھی ہیں اور سخن شناس بھی۔ محوِ گفتگو ہوتے ہیں تو دہن گل افشاں ہوجاتا ہے یعنی منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور سامع کے مشامِ جاں معطر ہوجاتے ہیں۔
- اخلاق کے پیکر ہیں۔ خوش روئی ان کی عادت ہے اور خوش باشی ان کا مقدر۔

اللہ الکریم مصنفِ محمود کو نظرِ بد سے بچائے، مفید سے مفید اور مزید سے مزید خدماتِ دینیہ وعلمیہ انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ وآلہ وصحبہ الصلاۃ والتسلیم

دعاگو

محمد عبد المبین نعمانی قادری

ناظم اعلیٰ : دار العلوم قادریہ چریا کوٹ، مئو

رکن : المجمع الاسلامی مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

۱۰؍ رجب المرجب ۱۴۴۵ھ

۲۲؍ جنوری ۲۰۲۴ء بروز ایمان افروز دوشنبہ

وسط ایشیا کی تاریخی حیثیت

خطۂ وسط ایشیا (Central Asia) دنیا جہان کے لیے نامانوس ہو تو ہو، شیفتگانِ علم و کمال اس کی بے مثال عظمت و ناموس سے کبھی نابلد نہیں ہو سکتے!۔ خصوصاً مروجہ درسِ نظامی کے فیض یافتگان کی نگاہوں میں تو اس خطے کی رفعت و شوکت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ یہاں سمرقند و بخارا کے ساتھ طاشقند، قوقند، وادیِ فرغانہ، مرغینان، غجدوان، نمنگان، سرخس، فاریاب، جوزجان، نسف، قرغیز، قزوین، ترمذ، نسا، خیوا، خوارزم، یوں ہی قزاقستان، ترکمانستان، تاتارستان، تاجکستان، کرغستان، داغستان اور آذربائیجان کے بعض علاقے بھی جلیل القدر ائمۂ عظام و اعلامِ اُمت کے مولد و مسکن اور علمی جولان گاہ رہے ہیں۔

اس خطے کے نوابغِ رجال نے دنیا جہان کو کمالاتِ علمی سے آشنا کرانے، برکاتِ فقہ و تصوف سے شناسائی بخشنے، اسرارِ تفسیر و حدیث سے پردہ اٹھانے، نحو و کلام کی گتھیاں سلجھانے، تاریخ و جغرافیہ کی پراسرار دنیا کا انکشاف کرنے، طب و بلاغت کی نزاکتوں پر مطلع کرانے، ادب و معانی کی بہاروں سے لطف اندوز کرانے اور فلسفہ و سائنس کی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی کرنے میں جو کارہاے گراں مایہ انجام دیے ہیں وہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ تاریخِ اسلام کی ان عبقری ہستیوں کو ایک ایسی جوے خوش آب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کے کناروں پر کھلے نرگس، لالہ اور یاسمن اس خطے کو پری خانہ بنائے ہوئے ہیں۔ گویا یہاں کے ذرّے ذرّے میں شمس و قمر خوابیدہ ہیں، اور یہ وہ خاکی تھے کہ جن کی نہاد نوری تھی اور جو مولا صفات تھے!۔

بلاشبہہ حجاز و کوفہ سے علوم و معارف کا جو خورشید تاباں ہویدا ہوا تھا، اس مردم خیز خطے میں پہنچ کر اس کی نور افشانی مزید فزوں تر ہو گئی، اور پھر یہاں کے علما و عرفا کا علمی

و روحانی فیضان صدیوں تک سارے عالم اسلام پر ابربارندہ کی مانند برسا۔ علامہ عبدالرحمن جامیؒ نے غالباً اسی کی طرف اپنے ایک شہرۂ آفاق شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

سکہ کہ دریثرب و بطحا زدند ۞ نوبت آخر بہ بخارا زدند

یعنی وہ سکہ جسے حرمین مقدس میں ڈھالا اور بنایا گیا تھا اس کی آخری دفعہ ڈھلائی خطۂ بخارا میں ہوئی!۔

آپ ذرا دیکھیں کہ دنیائے حدیث کے اوّلین ائمہ یعنی امام بخاری (م۲۵۶ھ)، امام ترمذی (م۲۷۹ھ)، امام نسائی (م۳۰۳ھ)، امام دارمی (م۲۵۵ھ)، اور امام اسحٰق بن راہویہ (م۲۳۸ھ) یہیں تولد ہوئے۔ فقہ و تفسیر میں امام شمس الائمہ سرخسی (م۴۸۳ھ) صاحب المبسوط، امام فخر الدین حسن اوزجندی (م۵۹۲ھ) صاحب فتاوی خانیہ، امام و فقیہ برہان الدین مرغینانی (م۵۹۳ھ) صاحب ہدایہ، امام علاء الدین سمر قندی (م۵۳۹ھ) صاحب تحفۃ الفقہاء، امام الہدیٰ فقیہ ابواللیث سمرقندی (م۳۷۵ھ) صاحب تنبیہ الغافلین، ملک العلماء امام ابو بکر کا سانی (م۵۸۷ھ) صاحب بدائع الصنائع، امام ابوالبرکات نسفی (م۷۱۰ھ) صاحب مدارک التنزیل، امام ابو بکر قفال الشاشی (م۳۶۶ھ)، ملا علی قاری حنفی (م۱۰۱۴ھ) اور امام ابو منصور ماتریدی (م۳۳۳ھ) کا یہی وطن مالوف رہا۔

یوں ہی امام طب و حکمت ابن سینا (م۴۲۷ھ)، فیلسوفِ وقت ابو نصر الفارابی (م۳۳۹ھ)، ماہر ہیئت و فلکیات ابوریحان البیرونی (م۴۴۰ھ)، ماہر ریاضیات محمد بن موسی الخوارزمی (م۲۳۲ھ)، ماہر جغرافیہ وفلکیات احمد بن محمد الفرغانی (م۲۴۷ھ)، ماہر ریاضیات وفلکیات سلطان الغ بیگ (م۸۵۳ھ)، امام لغت وادب علامہ ابونصر اسمٰعیل الجوہری (م۳۹۳ھ) صاحب کتاب الصحاح، علامہ ابو عبد اللہ الکاتب الخوارزمی (م۳۸۷ھ) صاحب مفتاح العلوم، علامہ محمود الزمخشری الخوارزمی (م۵۳۸ھ) صاحب کشاف، علامہ ابو بکر الخوارزمی (م۳۸۳ھ)، علامہ یوسف السّکاکی (م۶۲۶ھ)، اور علامہ سعد

الدین تفتازانی (م ۷۹۳ھ) جیسے شہرۂ آفاق ادبا و فضلا اسی خطے کے پروردگان تھے۔

تصوف و طریقت کے ائمہ میں شیخ الشیوخ خواجہ بہاء الدین نقشبند (م ۷۹۱ھ)، خواجہ عبید اللہ احرار ولی (م ۸۹۵ھ)، خواجہ ابویعقوب یوسف ہمدانی (م ۵۲۶ھ)، خواجہ احمد یسوی پیرِ ترکستان (م ۵۶۲ھ)، اور حضرت نجم الدین کبریٰ (م ۶۱۸ھ) بھی یہیں سے اٹھے کہ جن کی روحانی برکات و توجہات سے آج پورا عالم اسلام مستفید و مستنیر ہو رہا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مردم خیز اور علم نواز خطے سے ایسے ایسے عباقرۂ زماں اور صلحاے روزگار اٹھے ہیں کہ جن کے علمی جلال و طمطراق اور روحانی کمال و شوکت کی دھنک افق در افق پھیلی ہوئی ہے، اور ان یگانۂ دہر ہستیوں کا نام آتے ہی گردنیں فرطِ عقیدت سے خم ہوجاتی ہیں۔

اربابِ علم و کمال کے اس سرسری جائزے سے ایک خاص بات یہ بھی ابھر کر سامنے آرہی ہے کہ مدارسِ اسلامیہ میں صدیوں سے پڑھائے جانے والے **درسِ نظامی** کا نصف فیصد نصابی خمیر یہیں کے علما کے متون سے تیار کیا گیا ہے، اور ان کی مصنفات و تحقیقات بلامبالغہ اسلامی علوم و فنون کے لیے اُمہات الکتب قرار دی جاسکتی ہیں۔

اسی لیے اہلِ ازبک کو نہ صرف اس بات پر فخر ہے کہ وہ تیمور اور بابر کے ہم وطن ہیں بلکہ وہ اس پر بھی سوجان سے نازاں ہیں کہ یہ امام بخاری و ترمذی اور امام ابومنصور ماتریدی جیسے ائمہ حدیث و کلام، شیخ بہاء الدین نقش بند و شیخ احمد یسوی جیسے مشائخ طریقت، ابن سینا جیسے سائنس داں، البیرونی و فارابی و خوارزمی جیسے فلاسفر اور علی شیر نوائی جیسے شاعروں کی تاریخی سرزمین ہے۔

غرضیکہ سمرقند و بخارا علمی اعتبار سے روے زمین کے بڑے گراں قدر اور وقیع ترین خطے ہیں، یہ ہر اعتبار سے انمول ہیں، ان کی کسی بھی چیز کا کسی بھی اعتبار سے سودا

نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن نہ معلوم کیسے حافظؔ سعدی شیرازی جیسا دیدہ ور انسان اپنے شیرازی محبوب کے تِل کی خوب صورتی پر فریفتہ ہوکر بدلے میں سمرقند و بخارا بخشنے پر رضامند ہوگیا۔ انھوں نے کہا تھا ؂

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بہ خالِ ہندویش بخشم سمرقند و بخارا را

یعنی اگر میرا شیرازی محبوب میرا دل تھام لے تو اس کے تل کے عوض میں سمرقند و بخارا بخش دوں گا!۔

ترکستان میں اِسلام کا ظہور و شیوع

یاد رہے کہ آج کا تُرکستان ہرچندکہ قزاقستان کا ایک مردم خیز و معارف پرور شہر ہے؛ لیکن قدیم مآخذ میں 'ترکستان' کا اطلاق یہاں کے سارے ہی اِستانوں پر ہوا کرتا تھا؛ کیوں کہ یہ سارا کا سارا علاقہ ترک تاتاری نسلوں سے آباد تھا، جنھوں نے دو مشہور دریاؤں سیحون و جیحون کے درمیان بود و باش اختیار کررکھی تھی۔

ان ترکستانی باشندوں کی خوش بختی یہ رہی کہ یہ دوردراز علاقوں میں بھیجے گئے مجاہدین و مبلغینِ اسلام کی مساعی جمیلہ سے عہدِ اول ہی میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے، اور اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں علم و معرفت کے فیوض و انوار کشید کر کے خود کو رشکِ آفتاب و ماہتاب بنا لیا تھا، جن کی فیض بخش کرنوں نے عہد ما بعد کو نور بداماں بنائے رکھا۔ اوّلین مبلغین میں عم زادۂ رسولِ مقبول حضرت قثم بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما (م۵۷ھ) اور حضرت سعید بن عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، جنھوں نے قریباً ۴۵ھ میں فروغِ اسلام کی خاطر

کائنات کے عزیز ترین خطہ مدینۃ الرسول کو چھوڑ کر اس علاقے کا رخ کیا، اور اپنی پیہم مساعی سے خطے کی تقدیر جگا کر رکھ دی۔ پھر دیگر مبلغین ودُعاۃ آتے رہے، کڑی سے کڑی ملتی گئی اور پورا علاقہ مطلع انوار و مرجعِ ابرار بن گیا۔

وہ جو اِس سفر کا سبب بنا

سفر جہاں نمونۂ سقر ہوتا ہے وہیں اسے وسیلۂ ظفر بھی مانا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ مختلف دیار واَمصار کے رحلات سے بھری پڑی ہے، جن میں رحلہ ابن جبیر اور رحلہ ابن بطوطہ کو عالمی شہرت و بے انتہا پذیرائی حاصل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک انسان جب اپنے عباد و بلاد کو رب کائنات کے سپرد کر کے عازمِ سفر ہوتا ہے تو پھر قدم قدم پر رحمتِ مولیٰ دست گیری فرماتی ہے، پریشانیاں آسانیوں کا روپ دھارنے لگتی ہیں، اور پھر اس امداد و کرم کا سلسلہ اس وقت اور دراز ہونے لگتا ہے جب دعوت و تبلیغ کا بے لوث مقصد بھی اس سے وابستہ کر دیا جائے۔ یہ سچ ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
تھکے جو پاؤں تو چل سر کے بَل نہ ٹھہر آتشؔ
گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

بعض خلافتیں اور خرقہائے صوفیہ بڑے متبرک، نفع رساں اور سریع القبول ہوتے ہیں، اور اس کی برکتیں معاً کرامتیں دکھانا شروع کر دیتی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دو ماہ قبل ترکی کی ایک عظیم اسلامی شخصیت اور نامور دکتور نے فقیر قادری کو پیرِ ترکستان حضرت خواجہ احمد یسوی علیہ الرحمہ (م ۵۶۲ھ) کے سلسلۂ عالیہ یسویہ کی خلافت سے مفتخر کیا۔ دراصل انھیں راقم السطور سے دلائل الخیرات، حزب البحر، حزب سیفی اور

قصیدہ بردہ کی اَسناد درکار تھیں تو بدلے میں انھوں نے کرم فرماتے ہوئے چند مشاہیر سلسلوں کی خلافتیں ہمیں بھی عطا کردیں، جن میں ایک خانوادۂ یسویاں کی بھی تھی، یہ چھٹی صدی کے بہت ہی مقتدر اور بافیض بزرگ گزرے ہیں، جن کے روحانی تصرفات و توجہات سے ترکستان کا چپہ چپہ فیض بخش عالم بنا ہوا ہے۔

مجھے اسباقِ تاریخ کے ابتدائی دنوں ہی سے ترکستان کی تہذیب وثقافت اور اسلام و مسلمین کے لیے پیش کی گئیں ان کی متنوع خدمات سے خدا واسطے کا عشق رہا ہے۔ دولتِ عثمانیہ کی فتوحات اور اسلامی خدمات سے کس کو انکار ہوسکتا ہے!۔ بیچ میں معروف اسلامی اسکالر و دانش ور ہارون یحییٰ اور مشہور شیخ طریقت امام عثمان نوری توپ باش کی کئی ایک معرکۃ الآرا کتابوں اور مقالات کے ترجمے کرنے سے میرے اندرون میں یہ دبی چنگاری مزید بھڑک اٹھی۔ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے اپنی مشہور نظم جواب شکوہ میں اسی قوم وقبیلہ کی جانب اِشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں 'شانِ کئی' سے اقبال کی مراد 'سلجوقی سلطنت اور سلطنتِ عثمانیہ ہی تھی۔ اور شعر میں اس نئی دنیا کا حوالہ ہے جہاں سلطنتِ عثمانیہ کی توسیع کے نتیجہ میں اسلام پہنچا تھا۔ سلجوقی سلطنت کے بہت سے بادشاہوں کے نام کا جزوِ لقب 'کَے' ہوتا تھا جیسے : کَے خسرو، کَے قباد، کَے کاس وغیرہ۔ یہ لقب قبیلہ کئی سے ان کے انتساب اور شجاعت وجواں مردی کی دلیل ہوتا تھا۔

بہرحال! ممکن ہے یہ میری اسی دیرینہ شیفتگی اور اعتقاد کی پختگی کی برکت رہی ہو کہ کچھ ہی ہفتے بعد پیرِ ترکستان خواجہ احمد یسوی علیہ الرحمہ کی نگاہِ توجہ اس فقیر کی طرف اٹھی اور اپنی بارگاہ کی حاضری سے ہمیں مشرف کردیا۔

اچانک ترکستان کی دعوت ملی اور ہم مختصر سی تیاری کے بعد نئے سال کے آغاز پر یکم جنوری ۲۰۲۴ء کو سرِ صبح قزاقستان کی راجدھانی الماٹے کے لیے آمادۂ سفر ہوگئے۔ قزاقستان ہندستان کے ان ہمسائے ملکوں میں ہے جہاں کے لیے ویزہ درکار نہیں ہوتا، آن ارائیول اسٹامپ (On Arrival Stamp) کفایت کرتا ہے۔ ترکستان چوں کہ قزاقستان کا ایک مردم خیز اور نہایت قدیم تاریخی شہر ہے؛ اس لیے ہم حسب پروگرام پہلے قزاقستان پہنچے۔

رفیقِ سفر کے طور پر میرے ساتھ میرے چہیتے بھانجے عشرت قمر بھی تھے، اِن کے کچھ دوست قزاقستان میں MBBS کر رہے تھے تو انھوں نے میری معیت کو غنیمت جانا اور ساتھ ہولیے۔ چوں کہ یہاں کی کیر نسی بہت چھوٹی ہے اور بڑے بڑے کورسیز کم فیس میں فائنل ہوجاتے ہیں؛ اس لیے ترکستان، کرغستان، ازبکستان اور یوکرین وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں ہزاروں انڈین سٹوڈنٹ مختلف کورسیز کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں؛ مگر ایم بی بی ایس کرنے والوں کی شرح کافی زیادہ ہے۔

اندازہ لگائیں کہ جو کورس وہاں تیس چالیس لاکھ میں فائنل ہوجاتا ہے، وہی کورس انڈیا میں کرنے کے لیے سوا یا ڈیڑھ کروڑ فیس دینی پڑتی ہے، مغزماری اور ناز برداری اس پر مستزاد۔ ابھی حال ہی میں جب روس یوکرین جنگ شروع ہوئی تو اس میں سب سے زیادہ پریشانی MBBS کرنے والے انڈین طلبہ ہی کو اٹھانی پڑی تھی۔ اور پھر ان کے ساتھ ستم بالاے ستم یہ ہوا کہ ایسے سنگین حالات میں بھی انڈین حکومت نے ان کی کوئی خاطر خواہ مدد نہیں کی، اور یہ سلگتا موضوع ہفتوں میڈیا کی شہ سرخیوں میں گردش کرتا رہا۔

ہر چند کہ ہماری منزل ترکستان تھی؛ لیکن جب الماٹے پہنچ گئے تو سوچا کہ یہاں بھی قدرت کے دل کش نظارے موجود ہیں، فطری مناظر کا ایک جہان آباد ہے اور

دنیا جہان کے سیاحوں کے قافلے جوق در جوق یہاں کے تاریخی مقامات کے حسنِ کرشمہ ساز سے لطف اندوز ہونے کے لیے اُترتے رہتے ہیں؛ لہٰذا ہمیں بھی بفرمانِ قرآنی سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ کے تحت اپنے دیدہ ودل کو اس شہر کے تاریخی نظاروں اور قدیم بہاروں سے تازگی و شگفتگی بخش لینی چاہیے۔ پھر فطرت کو اگر فاطر کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کا کیف و مزہ صد آتشہ ہو جاتا ہے!۔

واقعتاً قدرت نے بڑی فراوانی کے ساتھ وسط ایشیا کے ان خطوں پر نعمتیں نچھاور کی ہیں۔ تاحدِ نگاہ اَطراف وجوانب میں سینہ تانے نوع بنوع پہاڑوں کے سلسلے، پھر اُن برفانی پہاڑوں کی پیشانی پر دھنکی ہوئی روئی کے مانند جمے برف کے گالے، جا بجا رنگ برنگ کے دیدہ زیب پھول، پھلوں سے لدی خوشبودار وادیاں، آبِ زلال رکھنے والے بڑے پاٹوں کے بل کھاتے دریا، من موہنے پرندوں کے روح پرور چہچہے، قدیم وجدید تاریخی عمارتوں کے درودیوار پر نقش ونگار کی سحر طرازیاں، تہذیب وشائستگی کا بانکپن، منظّم زندگیاں، اور مربوط بازاریں اپنے اندر زائرین وسیاحین کے لیے لائق تحسین ہونے کے ساتھ درجنوں قابل تقلید نمونے بھی رکھتی ہیں۔ مناظرِ قدرت کا یہ خوشنما جہان صرف قزاقستان ہی کا اختصاص نہیں، بلکہ بخارا، سمرقند، طاشقند اور وادیِ فرغانہ وغیرہ کے بیشتر خطے بھی ان دولت ہائے بے داد سے مالامال ہیں۔

میں حیران ہوں کہ قدرتی ذخائر، فطری محاسن اور حسن تعمیر کے نادرِ روزگار نمونے رکھنے والے ان اِستانوں سے حسنِ فطرت پر تن من دھن نچھاور کر دینے والے یوروپین ابھی تک نابلد کیوں ہیں؟ اور وہ یہاں آکر سلاطین اسلام کی ہمہ جہت خدمات اور تاج محل کو منہ چڑھاتی تعمیرات کا سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کیوں نہیں کرتے!؟۔ شاید انھیں ڈر ہو کہ سیاحت چوں کہ تجارت کا بہترین ذریعہ ہے، اور اس سے ملکی معیشت کو استحکام نصیب ہوتا ہے، اور یہ سب آزاد مسلم ریاستیں ہیں، اب اگر

ہم نے ان کی اِقتصادیات کو مضبوط کرنے کی غلطی کردی تو کہیں پھر یہ دوبارہ ایک ناقابل شکست طاقت بن کر نہ ابھر جائیں!۔ لیکن انھیں یہ حقیقت ہمیشہ ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

سرزمین قزاقستان

یہ وسطی ایشیا کا شاہ راہِ ریشم کے دہانے پر واقع رقبے کے لحاظ سے خشکی میں محصور دنیا کا نواں سب سے بڑا ملک ہے۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں سویت یونین (Soviet Union) کے انہدام کے وقت وسط ایشیائی ممالک میں کئی ایک مسلم اکثریتی ملکوں نے بھی آزادی حاصل کی، انھیں میں ایک قازقستان یا قزاقستان بھی تھا۔ اس کا یوم آزادی ۱۶ دسمبر ۱۹۹۱ء ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ خانہ بدوشوں کی ہر طرف سے وادیوں سے گھری ایک جنت نظیر سرزمین ہے۔

قزاقستان کے لاتمناہی میدان اور ناہموار پہاڑ ملک کی خوبصورتی کا استعارہ ہیں۔ جب بھی کوئی سیاح برف سے ڈھکی چوٹیوں کے دامن میں موجود سرسبز میدانوں میں کیمپنگ کرتا ہے تو خود کو کسی دوسری دنیا میں کراتا محسوس کرتا ہے۔ یہاں کی برف پوش چوٹیاں طلوع و غروبِ آفتاب کے وقت جس انداز سے چمکتی دمکتی اور آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں ایسا لگتا ہے جیسے برف کے اوپر کسی نے سونے کے ذرّات بکھیر دیے ہوں۔

ترکی و فارسی میں قزاق ڈاکو کو کہا جاتا ہے، قزاقستان کی وجہ تسمیہ شاید یہی ہو کہ چنگیز خان جیسے شیر دل بہادر نے قزاقوں کی ایک فوج لے کر دنیا میں ہلچل مچادی تھی

اور روسیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر چھوڑا تھا۔ اہل قزاق کو گھوڑوں کا بہت شوق ہے، بڑے بڑے اصطبل ہیں، جن میں دیسی بدیسی گھوڑے بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے میدان گھوڑوں اور اونٹوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں نہ صرف گھوڑے پالے جاتے ہیں بلکہ شوق سے ذبح کر کے ان کا گوشت بھی بڑی رغبت سے کھایا کھلایا جاتا ہے۔ یہاں سب سے اعلیٰ ضیافت گھوڑے کے گوشت کی مانی جاتی ہے!۔

قزاقستان ہر چند کہ ایک آزاد مسلم ریاست ہے، جس کی آبادی دو کروڑ افراد سے زائد پر مشتمل ہے۔ بلحاظِ آبادی دنیا میں یہ باسٹھویں نمبر پر آتا ہے، اور اس کی کثافتِ آبادی صرف چھ افراد فی مربع کلومیٹر ہے۔ یہاں کے پھل پھول، جدید عمارتیں اور کشادہ سڑکیں شہر کے حسن و کشش کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ شہر سے متصل ہی ایک بہت بڑی اسکیٹنگ پہاڑی چوٹی ہے، جہاں اسکیٹنگ کھیل کے شائقین کا سارا سال تانتا بندھا رہتا ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے اہل ہمت و شوق آتے ہیں اور مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہو کر شاداں فرحاں واپس جاتے ہیں۔

شِمبولک (Shymbulak) کی سیر

یہ الماٹے شہر سے پچیس کلومیٹر دور الو یٹو پہاڑیوں پر واقع ایک مشہور میڈیو ویلی ہے۔ اس کی سطح ' سمندر سے دو ہزار دو سو ساٹھ میٹر بلند ہے۔ یہ سینٹرل ایشیا کا اولین اور دنیا کا تیسرا سب سے بڑا کارٹریک ہے۔ چنانچہ ہم بھی سکیٹنگ والے پوائنٹ کو دیکھنے کے لیے کمرِ ہمت کسی، اسے زِپ لائنر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ قدرت کے حسین ترین مناظر میں سے ایک ہے۔ تاحدِ نگاہ کوہِ فلک پیما، ان پر تہ بہ تہ جمے برف کے تودے، پھر برفانی فضاؤں میں کوکو کرتی پہاڑی کویلیں، اور دندناتے پھرتے چوپایے اس پوائنٹ کی رعنائی و دلکشی میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ یہاں سیاحوں کا

ایک ہجوم تھا، ٹکٹ کاونٹر پر ایک لمبی قطار لگی تھی، بہرحال! ہم کیبل کار کی لائن میں آ گئے، قدم کھسکتے رہے، بالآخر ہم کار میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

کار کے اندر آٹھ لوگوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ جیسے ہی کار اوپر کی طرف چلی، دل دھک سے ہو کر رہ گیا!۔ اب نگاہوں کے سامنے ایک برفانی کائنات تھی، پوری وادی دودھیا چاندنی کی مانند چمک رہی تھی، مناظرِ قدرت سے نگاہیں چار کراتے ہوئے کار پہلے اسٹیشن پر رُکی، جہاں سکیٹنگ کے لیے نوآموز ''مجاہدین'' کھڑے تھے، اور پھر وہ نشیبی وادی کی طرف سرپٹ دوڑ پڑے، سردی بہت شدید تھی، ہاتھ پاؤں گل رہے تھے، چیک کیا تو پتا چلا اس وقت ٹمپریچر منفی ۱۵ ہے۔ کچھ دیر یہاں سیر و سیاحت کرنے کے بعد ہم نے دوسرے اسٹیشن کے لیے کوچ کیا۔

یہاں کے مناظر بھی پہلے ہی طرح خوش نما تھے، ہاں درجۂ انجماد یہاں کافی بڑھ گیا تھا، ہوا بھی جان لیوا بننے لگی، پھر ہم اللہ اللہ کر کے آخری پڑاؤ پر پہنچے، جہاں کا کلائمٹ قریبا مائنس ۲۵ تھا۔ اب ہم بالکل پہاڑ کے سرے پر کھڑے تھے اور برف کی سلیں ہمارے جوتوں کا برا حال کر رہی تھیں۔ اس کا جائے وقوع سطح زمین سے تقریباً دس ہزار فٹ اونچا ہے۔ یہاں تو اعضا بالکل شل پڑ گئے، قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا، ناک میں ہلکے ہلکے برف جمنا شروع ہو گئے، جب ہماری گھبراہٹ بڑھی تو ہمیں بتایا گیا کہ حکومت کی طرف سے یہاں جگہ جگہ اسٹیم روم بنائے گئے ہیں، جہاں پہنچ کر انسان اپنا بِگڑا توازن بحال کر سکتا ہے۔ یہاں سے سکیٹنگ کرنے کی اجازت صرف ماہرین کو ہے جو کیبل کار کے ذریعہ یہاں آتے ہیں اور پھر سکیٹنگ کرتے ہوئے نیچے چلے جاتے ہیں۔

یہاں مجھے کوئی انگریز نظر نہیں آیا، روسی چہرے بہت زیادہ تھے، کچھ انڈین بھی

ملے، زیادہ تر لوکل ہی تھے، جو اپنے بچوں کو سکیٹنگ سکھانے کے لیے یہاں لاتے ہیں؛ کیوں کہ ٹریننگ اور تربیت کے لیے اس سے بہتر جگہ انھیں نہیں مل سکتی، اور بعض بچے تو ہمیں اس مہارت وحذاقت سے سکیٹنگ کرتے نظر آئے کہ مانو یہ مادر زاد سکیٹرز ہوں!۔

پھر وہاں سے واپسی کے بعد ہم ایک لہلہاتے باغ میں آئے، طرح طرح کے گلاب کھلے ہوئے تھے، موسم کی یخ بستگی کی وجہ سے بہت سے پودے کمھلائے نظر آئے، اور بیشتر برف تلے دبے تھے۔ وسط میدان میں ایک عجوبۂ روزگار بلڈنگ تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ اسے صرف لکڑیوں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے اور اس میں لوہے کی ایک کیل بھی استعمال نہیں ہوئی۔ عمارت تو واقعتاً تاریخی تھی؛ لیکن یہ دراصل ایک کیتھیڈرل چرچ تھا؛ اس لیے اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی؛ ہم نے بس باہر ہی سے معائنہ کیا اور اپنے ہوٹل کی طرف کوچ کر گئے۔ شنیدہ ہے کہ اعلیٰ حضرت سیدی امام احمد رضا محدث بریلوی کا بھی ایک بار کسی انوکھی طرزِ تعمیر سے گزر ہوا تھا، جب آپ نے پوچھا تو بتایا گیا کہ یہ عیسائیوں کی عبادت گاہ چرچ ہے تو آپ نے برجستہ فرمایا ؎

الٰہی معبدِ اہلِ کلیسا ہے یہ گرجا
یہ گرجا گھر ہے گرجا گھر ہے گِرجَا

ہوٹل کے بغل ہی میں ایک عالی شان شاہی مسجد تھی، جسے بڑی عمدگی و شاندار نقاشی کے ساتھ بنایا گیا تھا اور گنبدزرّیں کے ساتھ میناروں سمیت ہر جگہ سنگ مرمر کا کام ہوا تھا۔ اندر کا حصہ باہر سے زیادہ جاذبِ نظر اور روح پرور تھا۔ یہاں جس طریقے سے باہر شدید ترین ٹھنڈ سے انسان پریشان رہتا ہے، ویسے ہی مسجد یا مکان کے اندر جاتے ہی معتدل درجۂ حرارت پاکر طبعی توازن برابر ہوجاتا ہے۔

چوں کہ روس کے بیشتر خطے شدید یخ بستگی کے شکار ہوتے ہیں، بعض علاقے کا ٹمپریچر تو منفی تیس چالیس تک چلا جاتا ہے۔ حکومتیں موسموں پر تو پابندی نہیں لگا سکتیں؛ لیکن لوگوں کو سہولیات تو فراہم کی ہی جا سکتی ہے؛ چنانچہ وہاں سرکاری سطح پر روم ہیٹر اور گیزر کے اعلیٰ انتظامات ہوتے ہیں اور ہر ایک شہری کو اس سے لطف اندوز ہونے کا یکساں موقع ملتا ہے، خاص بات یہ کہ اتنے بڑے پیمانے پر کیے جانے والے یہ سب انتظامات مفت ہوتے ہیں۔

یہاں مسجدوں میں ترکی انداز کے بیسیوں زینے والے بڑے بڑے منبر بنے ہوتے ہیں، جمعہ کے دن ایک خوش الحان قاری منبر کے بالکل بالائی حصے سے سورۂ کہف کی تلاوت کرتا ہے اور جملہ مصلّیان نہایت انہماک و شوق کے ساتھ اس کی تلاوت سے محظوظ ہوتے ہیں۔ پھر خطبہ سے قبل نصف گھنٹے کا بیان ہوتا ہے، ازاں بعد نماز و دعا کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اخیر میں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے، پھر اجتماعی دعا کے ساتھ ایک دوسرے کو جمعہ کی مبارک بادی دیتے ہوئے لوگ اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوجاتے ہیں۔

یہ طرز و انداز پورے سفر میں تمام مسجدوں میں دیکھنے کو ملا۔ ایک خاص بات یہ بھی دیکھی کہ لوگوں کے اندر دوسروں کی خدمت کا جذبہ اس حد تک موجود ہے کہ نمازیوں کے جوتوں کا رخ سیدھا کرنے میں کوئی تکلف یا عار محسوس نہیں کرتے اور اپنی نیکی و سعادت سمجھتے ہوئے بڑے بڑے لوگ چھوٹوں کے جوتے برابر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ریک ہو یا فرشِ زمین ہر جگہ جوتے ایک خاص ترتیب سے صف بندی کے انداز میں لگے ہوتے ہیں۔ گویا یہ بھی ان کی تربیت کا حصہ ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان جب اندر سے بھرا ہوتا ہے تو پھر باہر اس کے مظاہر نظر آ ہی جاتے ہیں۔ یعنی انھوں نے نماز کی صف بندی سے گویا یہ سبق اَخذ کیا کہ ایک خوشگوار زندگی سے لطف اندوز ہونے

کے لیے ہمیں زندگی کے بہت سے موڑ پر صف بندی کے نظم کو قائم رکھنا چاہیے، اوراس کی برکتوں سے خود بھی فائدہ اٹھانا چاہیے اور دوسروں کو بھی مستفید کرنا چاہیے اس تناظر میں کئی ایک احادیث بھی استشہاداً پیش کی جاسکتی ہیں۔ بعض دیگر ممالک میں بھی میں نے اس کا اہتمام دیکھا؛ لیکن یہاں کا انداز بڑا انوکھا اور دل چھوتا تھا!۔

ہمارے یہاں مساجد و محافل میں کسی کے جوتے کا رخ درست کرنا تو دور، اسے کچلنا، روندنا اور پوری دیدہ دلیری کے ساتھ اس پر چڑھ کر اپنے جوتے یا چپل تک پہنچنا گویا اپنا علاقائی یا موروثی حق سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً یہ سب تربیت کی کمی کے نتائج ہیں جس نے ہماری زندگیوں میں بہت سے نشیب و فراز کو جنم دیا ہے۔ ہم نے علم تو بہت حاصل کرلیا؛ لیکن تربیت کے نور سے محرومی کے سبب زندگی کی حقیقی برکتوں سے نہ ہم خود لطف اندوز ہو پارہے ہیں اور نہ ہمارے اسلامی معاشرہ کے افراد۔

بعض صوفیۂ صافیہ سے جب دریافت کیا گیا کہ دلوں کی قساوت و سختی کو دور کرنے کا مجرب نسخہ کیا ہے؟ تو انھوں نے یہی تجویز پیش کی تھی کہ نمازیوں کی جوتے درست کیے جائیں، اس سے دلوں کی سختی دور ہوگی اور دل لطف و طمانیت کی ناقابلِ بیان کیفیت سے معمور ہوجائے گا۔

ترکستان کی فیض بخش دھرتی

الماٹے میں دو روزہ قیام کے بعد ہم ایک سلیپر بس کے ذریعہ ترکستان کے لیے روانہ ہوئے۔ رات بھر چلتے رہے، اور سرِ صبح حسبِ وعدہ پیرِ ترکستان خواجہ احمد یسوی علیہ الرحمہ کی سرزمین پر قدم رنجہ ہوگئے۔ سیدھے خانقاہ کا رخ کیا۔ وہاں ہم کچھ پہلے ہی پہنچ گئے، دیکھا تو میرِ محفل ہمارے منتظر تھے، ملاقات و تعارف اور ناشتے کے بعد ہمیں دو سیکیورٹی کے ذریعہ پروٹوکول کے ساتھ بارگاہِ یسوی میں حاضر کیا گیا۔

کیا شاہانہ جاہ وجلال ہے حضرتِ خواجہ کا، کیسا عظیم و جلیل مقبرہ ہے اور پھر کیسے عالی شان وفلک پیما قلعے میں آرام فرما ہیں آپ۔ اگر امیر تیمور جیسا فاتح عالم آپ کی بارگاہ میں بصد نیاز جھک کر حاضری دیتا تھا تو یقیناً اسے یہی زیبا تھا کہ اس بارگاہ کی شوکت وسطوت ہے ہی ایسی!۔

نیازِ حاضری حاصل کرنے کے بعد درویش آفندی نے ہمیں خلعتِ دستار سے نوازا اور چند دیرینہ خانقاہی رسومات کی ادائیگی کے بعد میری مختصر بریفنگ کی اور میرے احوال و آثار سے آگاہ یاب ہوا۔ ازاں بعد مجھے ایک انگریزی دان خاتون کے ذریعہ خانقاہ کی ایک ایک چیز کی تفصیل پر اطلاع دی گئی۔ زبان کا بڑا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ پورے سفر میں دردِ سر بنا رہا۔ ''زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم'' والا مصرع زندگی بھر سنتے رہے؛ لیکن اس کی حقیقت اس سفر میں خوب خوب ظاہر ہوئی!۔

بہرحال! اس خاتون نے بہت ساتھ دیا اور بجھوں میں پھیلے روضے کے تاریخی آثار پر مجھے آگاہی بخشی۔ اس جگہ بھی لے گئی جہاں سے حضرت خواجہ نے ننانوے ہزار طلبہ و مریدین کو کُندن بنا کر اُمت محمدیہ کی خضر راہی کے لیے دور دراز علاقوں میں بھیجا تھا، اور ان کے ذریعہ سلسلہ یسویاں کا خوب فروغ ہوا تھا۔

خواجہ احمد یسوی علیہ الرحمہ کے قلعے میں

آپ سلسلۂ نقش بندیہ کے جلیل القدر بزرگ، شعر و سخن کے بادشاہ، مبلغ اسلام اور خانوادۂ یسویاں کے بانی ہیں۔ سلسلہ نسب حضرت محمد حنفیہ رضی اللہ عنہ سے ہوتا ہوا امیر المومنین شیر خدا سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں ۱۰۹۳ء میں سیرام شہر میں آپ متولد ہوئے۔ پرورش و پرداخت نہایت دینی و علمی ماحول میں ہوئی۔ والد ماجد شیخ ابراہیم مسلم الثبوت اور صاحب

کرامت بزرگوں میں تھے؛ لیکن ابھی آپ نے زندگی کی کوئی سات بہاریں بھی نہ دیکھی ہوں گی کہ داغِ یتیمی نے زندگی میں ایک بڑا خلا پیدا کردیا؛ تاہم آپ کی تعلیم جاری رہی، اور عنفوانِ شباب تک پہنچتے پہنچتے آپ نے روحانیت کی منزلیں طے کرلیں۔

بڑے متبعِ سنت اور مستجاب الدعوات تھے۔ علوم ومعارف سے بہرہ یاب اور دنیاے قلب وباطن کے اِمام تھے، جن کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لیتے اس کا دل جاری ہوجاتا تھا۔ آپ کی روحانی تربیت اورتہذیبِ نفس کے مدارج 'سلسلہ نقشبندیہ کے جلیل القدر بزرگ شیخ خواجہ ابو یعقوب یوسف ہمدانی (م۵۲۶ھ) کے قدموں میں طے ہوئے، جنھوں نے ساٹھ سال تک سجادۂ مشیخت وارشاد کو زینت بخشا تھا، اور اپنے زمانے کے اجلہ مشایخ میں شمار کیے جاتے تھے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خواجہ یوسف ہمدانی' سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی بغدادی (م ۵۶۱ھ) علیہ الرحمہ اور خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی (م۶۲۷ھ) علیہ الرحمہ کے شیخ بھی رہے ہیں۔ اور دونوں حضرات نے مختلف اوقات میں چند مہینے خواجہ ہمدانی کی صحبت سے اکتسابِ فیض وکمال کیا ہے۔ اسی لیے خواجہ ہمدانی ان دونوں کے پیرِ تعلیم کہے جاتے ہیں۔ خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ کی ملاقات کے تعلق سے تو صاحبِ قصرِ عارفاں شیخ احمد علی چشتی نے بھی کچھ اشارہ دیا ہے، تاہم غوثِ پاک کے تعلق سے جملہ مصادر ومراجع مہر بلب ہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ خواجہ غریب نواز علیہ الرحمۃ والرضوان کا بھی خواجہ ہمدانی سے براہِ راست استفادہ ثابت نہیں؛ کیوں کہ دونوں میں معاصرت ہی قائم نہیں۔ خواجہ غریب نواز کی ولادت بلاخلاف ۵۳۷ھ میں ہوئی، اور خواجہ ہمدانی ان کی ولادت سے گیارہ سال قبل ہی وصال فرماچکے تھے؛ لہٰذا تاریخی شواہد خواجہ ہمدانی کے پیر تعلیم ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

خواجہ ہمدانی کے خلفا اور تربیت یافتگان میں دو بزرگوں نے عالمگیر شہرت پائی، جن میں ایک خواجہ عبدالخالق غجدوانی (م۶۱۷ھ) ہیں اور دوسرے خواجہ احمد یسوی۔ ۱۱۶۰ء میں آپ بخارا کے اندر شیخ کی گدی کو سنبھالنے کے لیے سلسلہ نقشبندیہ کے مرشدِ اعلیٰ بنے، لیکن پھر اس مشیخت کو آپ نے شیخ غجدوانی کے حوالے کر دیا اور خود ترکستان چلے گئے، جہاں مستقل قیام کرکے اپنے سلسلے کو خوب فروغ دیا، خلقِ خدا کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، اور ایسے ایسے تلامذہ و خلفا تیار کیے جن کی تبلیغ سے علاقے کا علاقہ اِسلام کے اَنوار سے جگمگا اُٹھا۔ خود ازبیک خان بھی آپ کے ایک مرید شیخ عبدالحمید کی تبلیغ پر ہی آغوشِ اسلام میں آیا تھا، جس کے نام پر اُزبیکستان ملک وجود میں آیا۔

خلقِ محمدی کا رنگ آپ پر ایسا چڑھا ہوا تھا کہ بتایا جاتا ہے کہ جب شیخ یسوی کی عمر ۶۳ سال ہوگئی تو فکرمند ہو کر فرمایا کہ میرے محبوب سید کونین ﷺ نے روے زمین پر اتنی ہی عمر گزاری تھی، میں اس سے زیادہ زندگی زمین کے اوپر نہیں گزار سکتا؛ چناں چہ آپ نے بقیہ زندگی زیرِ زمین ایک تہ خانے میں گزاری، جہاں ذکر و فکر اور عبادت و ریاضت کرتے کرتے واصل بحق ہو گئے۔

خاتون نے ہمیں وہ جگہ بھی دکھلائی اور ہم نے وہاں عجیب انوار و برکات کا مشاہدہ کیا۔ حضرت خواجہ یسوی یہاں ایک وسیع و عریض زمین پر فلک پیما قبہ و مینار کے سائے میں استراحت گزیں ہیں، دنیا جہان سے زائرین یہاں آکر فیوض و برکات کا ساغر دل کے کٹورے میں بھر بھر کر لے جاتے ہیں۔ یہاں آپ کا سلسلہ خوب برگ و بار لا رہا ہے اور لوگ کسبِ فیض کر رہے ہیں۔

پہلے آپ کا مقبرہ بہت بڑا نہیں تھا؛ لیکن امیر تیمور نے اپنے عہد میں شاہی

قلعوں کے انداز میں اس کی شایانِ شان تعمیر کرائی۔ اس کی دیواروں سے ہیبت و جلال ٹپکتا ہے اور اس کے چاروں میناروں کی موٹائی اور مرکزی گیٹ کی بلندی کا تو شاید دنیا میں کوئی جواب ملے!۔ پہلی قازق یونیورسٹی کا نام آپ کے اعزاز میں خواجہ یسوی یونیورسٹی رکھا گیا۔ دیوانِ حکمت نامی آپ کا مجموعۂ کلام معارف و حقائق کا گنجینہ ہے، جسے مختلف مطابع نے متعدد بار نئے رنگ و آہنگ میں شائع کیا ہے۔

خانقاہ کے بغل ہی میں ایک بڑے وسیع و عریض کیمپس کے اندر University of tourism & hospitality بنی ہوئی ہے، جس کی انوکھی عمارتیں، نظریں اچک لینے والے آرٹ، قدیم بازار، سرائے خانے، اور سنیما گھر وغیرہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں ایشیا کا دوسرا ایسا بڑا تھیٹر دیکھنے کو ملا جہاں 8D میں مووی دکھائی جاتی ہے۔ بیچ میں چمکتے پانیوں کی ایک شاندار خندق کھودی گئی ہے، جہاں اسٹیمروں پر بیٹھ کر آپ پورے کیمپس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ پورے کیمپس کا انداز نہایت خواب آلود ہے، وہاں کی ایک ایک چیز جی بھر کر دیکھنے اور سر دھننے سے تعلق رکھتی ہے، پھر اسلامی آرٹ اور آیتوں کی دیدہ زیب کیلی گرافی نے تو گویا پورے کیمپس میں جان ہی ڈال دیا ہے۔

ترکستانیوں کی بڑی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ خوش عقیدگی کے ساتھ آثارِ قدیمہ اور زیاراتِ مقدسہ کے امین بھی ہیں اور محافظ بھی۔ ان کے ہاتھوں تعمیر شدہ عمارتیں داد و تحسین کی مستحق ہیں۔ صدیاں گزر جانے کے بعد انھوں نے قدیم ترین عمارتوں اور تاریخی مقامات کو مِن و عَن آئندہ نسلوں کے لیے باقی اور محفوظ رکھ چھوڑا ہے، جن سے آج بھی زائرین و ناظرین نصائح و عبرت حاصل کرتے ہیں۔

اُزبکستان کی سیر

ترکستان کی بافیض حاضری اور دلچسپ تفریح کے بعد ہم شمقند (سِمکینٹ) پہنچے۔ یہ بھی ایک بڑا شہر تھا، اور اس سے تاریخ کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں بھی مناظرِ قدرت دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن ہمارے پاس وقت کی قلت تھی؛ اس لیے ہم سیدھے وہاں سے طاشقند کے لیے آمادۂ سفر ہو گئے۔

راستے میں از بیکستان کے بارڈر کو پار کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی؛ کیوں کہ ہمارے ویزے اور ڈاکیومنٹ بالکل درست تھے؛ حالاں کہ یہ ایک بڑا اعصاب شکن مرحلہ ہوتا ہے اور قطار اندر قطار کھڑے لوگ ڈاکیومنٹ پروف کرنے کے لیے اپنی باریوں کے آنے کے شدت سے منتظر ہوتے ہیں۔ بہر حال! ایک نئی مسلم ریاست، بالکل انوکھا ماحول، پھر زبان سے عدم شناسائی کا قہر!۔ یہ تو رب کریم کا بڑا کرم ہوا کہ ہم جب سِم کینٹ کی منی بس پر بیٹھے تو میری داہنی سمت بیٹھا شخص انگلش داں نکل آیا۔

یہ دراصل طاشقند یونیورسٹی کا ایک طالب علم تھا جو جاپانی لینگویج سیکھ رہا تھا، ساتھ ہی کچھ انگلش کی بھی شد بُد رکھتا تھا۔ ہم نے اللہ کی مدد سمجھتے ہوئے اس سے اپنی رودادِ سفر بیان کر ڈالی اور کہا کہ از بیکستان میں ہمارا کوئی شناسا نہیں؛ لیکن اللہ کی ذات پر بھروسا ہے کہ وہ ہمیں اس اجنبی ملک میں اکیلا اور درماندہ نہیں چھوڑے گا۔

وہ کہنے لگا آپ بالکل فکر نہ کریں میرا ایک دوست ہوٹل میں منیجر ہے، اور وہ بھی انگلش جانتا ہے، بہتر ہے کہ آپ اس سے بات کر کے بکنگ کر لیں۔ چنانچہ ہم نے پہلی فرصت میں اپنا ہوٹل بک کیا۔ پھر اس نے کسی کو فون لگا کر مجھے تھما دیا تو پتا چلا کہ یہ اس کا ایک کولیگ ہے جو طاشقند یونیورسٹی سے عربی زبان میں ڈپلوما کر رہا ہے۔

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا، اور طاشقند کی سیاحت وزیارت اسی کے ذریعہ بخیر وخوبی انجام پائی۔ ہر چند کہ وہ ابھی طالب علم تھا اور زبان بھی بہت کچی تھی؛ لیکن سیاق وسباق بہر حال مفہوم واضح کر دیتے تھے۔

طاشقند کی بہاریں

طاشقند 'شمقند اور سمرقند کے درمیان شاہراہ پر کاہِ التائی کے مغربی جانب زرخیز میدان میں واقع ہے۔ اس کا جائے وقوع اس لیے بھی بڑا خوبصورت ہے کہ وہ دریائے چرچک اور دیگر ذیلی دریایوں کا سنگم ہے۔ یہ خطہ آٹھویں صدی کے اوائل میں مملکتِ اسلامیہ کا حصہ بنا۔ عرب اس شہر کو الشش کہا کرتے تھے۔ بہت سے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے سوویت دور کی پابندیوں کے بعد یہاں کے مسلمانوں کو اپنی مذہبی رسومات کی ادائیگی اور اپنی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال کی کھلی اجازت ملی۔ ۲۰۰۷ء میں تاشقند کو اسلامی دنیا کا ثقافتی دارالحکومت قرار دیا گیا۔

ہر چند کہ آج یہ ازبکستان کا صدر مقام (راجدھانی) اور حکومتی مرکز ہے، جہاں چاروں طرف سرکاری دفاتر کے جال بچھے ہوئے ہیں؛ تاہم کسی زمانے میں اس کا پایۂ علمی بھی بڑا بلند وبالا رہا ہے۔ یہاں متعدد علما وائمہ اور صوفیہ و مشایخ کے عالی شان مقابر موجود ہیں، جن میں امام تصوف شیخ عبید اللہ احرار اور امام فقہِ شافعی شیخ ابو بکر قفال شاشی مشہور ہیں۔

قرآن میوزیم کی برکات

طاشقند کی زیارتوں میں سب سے اہم قرآن میوزیم ہے، جہاں دنیا جہان سے منگوائے گئے نادر ونایاب قرآن کے نسخے شیفتگانِ مصحف کو دعوتِ نظارہ دیتے

ہیں۔ اسی میں ایک ایسا جلیل القدر تاریخی کتب خانہ بھی ہے جس میں نایاب کتب اور مخطوطات کا خزانہ موجود ہے، اس کتب خانے کی اپنی ایک دلخراش اور دلچسپ داستان ہے۔

بھول بھولیا کی طرح چھوٹے چھوٹے کمروں کی دیواروں سے متصل شیشوں سے ڈھکے میزوں کے اوپر قرآن سجا کر رکھے ہوئے ہیں اور ان کے نیچے ایک ورقے پر ان کی ضروری تفصیلات مرقوم ہیں۔ میوزیم کے بالکل وسط میں ایک کشادہ ہال کے اندر خلیفۂ سوئم حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا وہ مقدس و نایاب مصحف بھی ہے جو بوقت شہادت آپ کے زیرِ تلاوت تھا، خون کے دھبے کا نشان آج بھی آیت مبارکہ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ کے اوپر چمک رہا ہے اور باغیوں کی شقاوت وازلی بدبختی پر شکوہ کناں اور اشک بار ہے!۔

یہ دنیا کا قدیم ترین نسخہ قرآن ہے۔ ۶۵۵ء کا یہ نایاب نسخہ امیر تیمور اپنے ساتھ سمرقند لایا تھا، جسے روسیوں نے قبضے کے بعد اسے سینٹ پیٹرز برگ منتقل کردیا تھا؛ لیکن ۱۹۸۹ء میں یہ نسخہ حکومتِ ازبکستان کو واپس کردیا گیا، جو آج ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک مقدس ورثے کا درجہ رکھتا ہے۔

ہم دیر تک اس کی زیارت سے شادکام ہوتے رہے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے رہے کہ ان گنہ گار آنکھوں کے سامنے عہد اوّل کا رقم کردہ تاریخی مصحف تشریف فرما ہے، ساتھ ہی بلوائیوں کی شومیِ قسمت پر ماتم کرتے رہے کہ انسان پر جب دنیا غلبہ پاتی ہے یا حسد وعناد جب کسی کو اپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں تو وہ کیسا اندھا بہرہ بن جاتا ہے کہ پھر نہ اسے کسی کی عظمت نظر آتی ہے اور نہ کوئی فضیلت سوجھتی ہے، بس وہ اپنے رذیل مقصد کے حصول کے لیے ہر حد سے گزر جانا چاہتا ہے!۔ قاتلهم اللّٰه انّٰی یؤفکون!۔

تقریباً دو بائی دو فٹ کا ایک صفحہ رہا ہوگا، خط نہایت جلی تھا؛ مگر حرکات و نقاط ندارد تھے۔ بہت زیادہ کوشش کرنے کے بعد سیاق وسباق کی مدد سے کوئی کوئی آیت سمجھ آجاتی تھی۔ سچ ہی کہا گیا ہے : خطان لا يقاسان، خط الكوافى وخط القرآن۔ یعنی دو خط قیاس سے ماوراہیں : ایک خط کوفی اور دوسرا خطِ قرآن۔

اس کے علاوہ یہاں قرآن مجید کے متعدد نادر نمونے موجود ہیں۔ایک قرآن زنگ پروف لوہے کی چادروں پر لکھا ہوا ہے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ یہاں کے حکام کے دل میں یہ بات آئی کہ زمانے انقلاب آشنا ہوتے رہتے ہیں، کیوں نہ قرآن کا ایک ایسا نسخہ تیار کروا دیا جائے جو سالہا سال تک محفوظ رہے؛ تاکہ اگر کبھی کوئی ناخلف قرآن مقدس میں تحریف کی کوشش کرے تو اس نسخے سے مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کی جاسکے۔

یہیں پر ایک ایسا قرآنی نسخہ بھی موجود ہے جو کاغذ کی ایجاد سے قبل درخت کے پتوں پر لکھا گیا تھا، اور پھر ان پتوں پر ایسی کیمیاگری کی گئی ہے کہ وہ اپنی اصل حالت پر موجود و محفوظ نظر آتے ہیں؛ حتیٰ کہ پتوں کی رگیں تک جھلک رہی ہیں اور ان پر لکھی قرآنی آیات چمک رہی ہیں۔

کچھ دیر ہم یہاں مراقب رہے، پھر شرفِ تلاوت حاصل کیا اور جملہ حاملین و خادمینِ قرآن مقدس کے لیے دل سے دعائیں کیں۔

یہ کئی ایکڑوں پر مشتمل ایک شاندار بقعۂ ارضی ہے، جسے ''حضرت کامپلیکس'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس میں جابجا عالیشان منارے چنے گئے ہیں، دیواروں پر نقش ونگار کی ایسی پر اَسرار دنیا بسائی گئی ہے کہ دیکھیے تو بس دیکھتے چلے جائیے، نظریں ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ فرشِ زمین پر ٹانکے گئے گل بوٹے حسنِ انتخاب کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔اس کمپلکس کے طول وعرض میں مدرسہ موے مبارک، مقبرۂ قفال شاشی،

براق خان مدرسہ، خواجہ احرار جامع مسجد، طلا شیخ مسجد اور امام بخاری اسلامک انسٹی ٹیوٹ وغیرہ موجود ہیں۔

ایک آزربائیجانی ڈیلی گیشن سے ملاقات

قرآن میوزیم سے جب ہم باہر نکلے تو آذر بائیجان کا ایک ڈیلی گیشن ملا، جس کا ایک سفیر پاکستانی فوجی آفیسر 'جنرل حمید گل سے مل چکا تھا، اس نے بڑے چاؤ سے ہاتھ ملایا اور پوچھا کہ آپ پاکستان سے ہیں؟ میں نے کہا نہیں ہندستانی۔ بٹوارے سے پہلے تو ہم سب ایک ہی تھے؛ لیکن تقسیم نے انھیں پاکستانی بنا دیا اور ہم اپنی اصل پر ہندستانی باقی رہے۔ وہ کھلکھلا کے ہنسا اور پھر حمید گل کے ساتھ بیتے ہوئے اپنے اچھے دن کی کچھ یادگار باتیں مجھ سے شیئر کرنے لگا۔

میں نے کہا کہ حمید گل سے میری ملاقات تو نہیں؛ تاہم ان کے بیٹے عبداللہ حمید گل ایک بار کسی سفارتی کام سے کیپ ٹاؤن ساؤتھ افریقہ آئے ہوئے تھے اور ساتھ ہی شیخ عبدالقادر الصوفی کے لیے بھی والد کا کچھ پیغام لائے تھے تو مجھے ان کا مترجم ہونے کا موقع ملا تھا، پھر اردو داں ہونے کے ناطے شیخ نے انھیں دو روز میرے حوالے کر دیا تھا، تو یوں ان سے دوروزہ ملاقات رہی اور انھیں ہر لمحہ اپنے باپ کے مشن کی تکمیل میں کوشاں پایا۔ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور دیر تک سینے سے چمٹائے رکھا۔

ابھی سلسلۂ کلام ختم نہیں ہوا تھا کہ اذانِ ظہر کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ قرآن میوزیم کے عقب میں سو میٹر کے فاصلے پر ایک رفیع البنیان و نادر المثال مسجد خواجہ عبیداللہ احرار ولی سے منسوب بنائی گئی ہے۔ آپ ہی سے منسوب ایک دوسری عظیم

الشان جامع مسجد' مدرسہ کوکلداش سے متصل مشرقی حصے پر بھی بنائی گئی ہے۔ ہم فوراً مسجد میں داخل ہوئے اور نمازِ ظہر مع جماعۃ المسلمین اَدا کی۔ دعاے ثانی کا یہاں عام رواج ہے۔ سلام کے بعد بس اللھم انت السلام ومنك السلام واليك يرجع السلام پڑھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پھر سنتوں کے بعد آیت الکرسی و تسبیح فاطمہ پڑھی جاتی ہے، اور عربی وازبک میں لمبی دعا مانگی جاتی ہے۔ یہ گویا سرکاری آرڈر ہے؛ اس لیے ہر چھوٹی بڑی مسجد میں ائمہ کو یوں ہی عمل درآمد کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

شیخ ابو بکر قفال شاشی علیہ الرحمہ کے قدموں میں

یہاں سے فراغت کے بعد ہم شیخ ابو بکر قفال الشاشی کے مقبرے پر پہنچے۔ یہ مقبرہ بھی اپنی بلندیناری اور نقش ونگاری میں کسی سے کم نہ تھا، تاہم اس پر پتھر کے کام زیادہ ہوئے تھے اور لگتا تھا جیسے پیلے پتھروں کو تراش کر اس کی تزئین کی گئی ہے۔ بغل میں ایک مکتبہ تھا جس میں خاصی تعداد میں عربی کتب موجود تھیں، بعض اردو کی کتابیں بھی یہاں نظر آئیں؛ مگر وہ کس کی ہو سکتی تھیں ہمارے دیدہ ور قارئین بآسانی سمجھ سکتے ہیں!۔

ہمیں کہاں اتنی فرصت کہ دور دراز علاقوں میں اپنی کتابیں بھیجیں، جو اُردو آشنا خطے ہیں یا ہندستان کی جو مشاہیر لائبریریاں ہیں ہم نے تو انھیں بھی اپنے تحقیقی شہ پاروں سے محروم کر رکھا ہے تو پھر ایک ایسے مقام پر جہاں کہ ''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم'' کا ماحول ہو وہاں کتابیں بھیجنا ہمارے نزدیک اسراف یا زیاں سے کم نہ ہوگا، اور یوں بھی اللہ مسرفین کو پسند نہیں فرماتا!۔ اللھم وفقنا لما تحبہ وترضاہ

پھر وہیں چند قدم کے فاصلے پر امام الشاشی سے معنون سے ایک بڑا مدرسہ قائم ہے۔ جائزہ لینے کے بعد پتا چلا کہ تعلیمی کارکردگی عمارت کے لحاظ سے نہایت سطحی

ہے، ہرچند کہ مدرسہ کافی قدیم ہے؛ لیکن یہ بھی شاید موسمِ خزاں کے بعد بادِ بہاری کا منتظر ہو اور کسی خضرِ راہ کا راستہ تک رہا ہو!۔

ہم نامی کا مغالطہ

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض سفرناموں میں مذکورہ امام الشاشی کو صاحب اصول الشاشی بتایا گیا ہے جن میں شیخ ابوالحسن ندوی کا سفرنامہ ''سمرقند و بخارا کی بازیافت'' بھی شامل ہے؛ تاہم میری تحقیق کے مطابق یہاں سیاحوں کو ہم نامی کا مغالطہ لگا ہے۔ یہ امام وفقیہ نظام الدین شاشی نہیں بلکہ یہ امام ابوبکر محمد بن علی القفال الشاشی (م ۳۶۵ھ) ہیں۔ ہرچند کہ دونوں کے درمیان معاصرت قائم ہے، دونوں شہرۂ آفاق مؤلف ہیں اور دونوں ہی شاشی ہیں؛ تاہم یہ امام شاشی شافعی ہیں اور قفالِ کبیر سے شہرت پذیر ہیں جب کہ صاحب اصول الشاشی حنفی فقیہ ہیں جن کا پورا نام ابوعلی احمد بن محمد نظام الدین الشاشی (م ۳۴۴ھ) ہے، اور مصر کے اندر مدفون ہیں۔

دکتور محمد اکرم ندوی کی تحقیق اور شیخ یوسف القرضاوی کے مقدمے کے ساتھ دار الغرب الاسلامی نے اصول الشاشی کو شائع کیا ہے، اور سرورق پر دکتور ندوی نے امام وفقیہ نظام الدین الشاشی کو ''من رجالِ القرن السابع الھجری'' لکھا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ یہ سہوِ محقق ہے یا خطاے کاتب!۔ جب کہ دونوں شاشیوں کے چوتھی صدی کے ہونے میں کسی کا کلام نہیں اور نہ ہی امام وفقیہ نظام الدین شاشی کی تاریخ وفات (۳۴۴ھ) میں کسی کا اختلاف ہے!۔

بہرحال! ہم نے امام شاشی کے مقبرے سے خوب فیض اٹھایا، اور دیر تک وہیں مراقب رہ کر ذکر و تلاوت کرتے رہے۔

مدرسہ کوکلداش کے صحن میں

پھر ہم یہاں کے قدیم ترین تاریخی مدرسہ کوکلداش کو دیکھنے گئے، جو پندرہویں صدی عیسوی کی یادگار ہے، اور جسے بنانے میں قریباً دو دہائی صرف ہوگئی تھی۔ یہ اپنے دور میں عجوبۂ روزگار مدرسہ تھا۔ ۱۵۵۷ء سے ۱۵۹۸ء تک برسر اقتدار رہنے والے عبداللہ خان کے عہدِ حکومت سے قائم ہونے والے مسجد و مدرسہ کو درمیانی تعطل کے بعد مسلمانانِ ماوراء النہر کے صوبائی مذہبی بورڈ نے دوبارہ بحال کر دیا ہے۔

ایک زمانے میں یہاں سے نامور فضلا اور علما فارغ ہوا کرتے تھے؛ لیکن روسیوں کی روسیاہانہ حرکتوں کے باعث یہ لہلہاتا علمی چمن بھی خزاں رسیدہ ہوگیا۔ ادھر دو ایک دہائیوں سے اس کے اِحیا کی تحریک اٹھی ہے اور یہ از سر نو برگ و بار لا رہا ہے۔ طلبہ میں سیکھنے کا جذبہ نظر آیا اور اساتذہ و مدیر سے مل کر بڑی اپنائیت کا احساس ہوا۔ ہرچندکہ اسے ایک عجائب گھر میں تبدیل کرنے کی مانگ ہورہی ہے؛ لیکن فی الوقت یہاں مدرسہ اپنی کارگردگی بڑی عمدگی سے پیش کررہا ہے۔ اللہ اسے ظالموں کی دست برد اور حاکموں کی ناانصافی سے محفوظ فرمائے۔ آمین

طریقۂ تعارفِ اہلِ علم

ان علاقوں میں اہلِ علم و کمال کے تعارف کے میں نے دو طریقے ملاحظہ کیے، سب سے پہلے تو تبرکاً قرآن کی آیات مہمان علما سے سماعت کرتے ہیں، پھر اگر وہ کسی شہرت کے حامل ہیں تو ''گوگل انجن'' سے اس کی بابت دریافت کرتے ہیں، اگر دنیاے نیٹ پر اس کے اَحوال و آثار بکھرے پڑے ہیں اور خلقِ خدا کے اس کی مدحت میں منقار وا ہیں، تو پھر کیا پوچھنا، اسے تاج سر بنایا جاتا ہے، اس کے لیے آنکھیں فرشِ راہ کی جاتی ہیں، اور اس کی خدمت ازلی سعادت تصور کی جاتی ہے۔

فقیر کا قرآنِ مجید کی کئی جہتی خدمت سے چوں کہ بچپن ہی سے ایک تعلق رہا ہے، نیز دوست احباب نے نیٹ پر میرے حوالے سے بہت کچھ ڈال رکھا ہے، بیشتر کتابیں اور اردو وانگریزی خطابات بھی موجود ہیں؛ اس لیے کسی محفل میں مجھے متعارف ہونے میں زیادہ وقت نہ لگتا تھا، اور پھر میں اہلِ ازبک کے لیے جلد ہی ایک مانوس فرد بن جاتا تھا۔

ایک مہمان نواز قوم!

من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ کا جلوہ یہاں کھلی آنکھوں دیکھنے کو ملا۔ لوگ مہمانوں کے لیے بچھ بچھ جاتے ہیں، اور ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ نچھاور کر دیں گے۔ پھر اہتمام سے ان کے ہاتھ دھلانا، تولیہ لیے با اَدب کھڑے رہنا، جوتے درست کرنا، کھانوں پر کھانے پیش کرنا، پھر اخیر میں مہمانوں کی دعائیں لینا اور اپنی نسلوں میں ایمان کی بقا، علم کی روشنی اور اسلام و مسلمین کی خدمت کی خصوصی دعا کرانا وغیر اہلِ ازبک کی دیرینہ روایات سے ہے۔

یہ تو اچھا تھا کہ ہم نے پہلے کہیں اہلِ ازبک کی ضیافت کا حال پڑھ رکھا تھا؛ اس لیے حظ لے کر دعوتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے؛ ورنہ بہت سے مقامات پر آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔ ہمارے ایک ازبکی کرم فرما بتانے لگے کہ چند سال قبل اہلِ عرب کا ایک علمی وفد یہاں آیا۔ کانفرنس کے بعد جب دسترخوان چنا گیا تو پہلے ابتدائیہ رکھا گیا، اس کے بعد تمہیدیہ۔

مہمانوں نے اسے ہی کل آئیٹم سمجھ کر شکم سیر ہو کر کھا لیا۔ پھر جب اصل کھانا سامنے آیا تو پوچھنے لگے یہ کیا ہے؟ ہم نے کہا: اصل کھانا تو یہی ہے۔ کہنے لگے: پھر

وہ کیا تھا؟ ہم نے کہا وہ اسٹارٹر تھا جسے رغبتِ طعام بڑھانے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ کہنے لگے: جناب! ہم نے تو وہی اصل سمجھ کر ضرورت سے زیادہ لے لیا ہے، اب مزید کی گنجائش نہیں۔ گویا یہ شعر قدرے تغیر کے ساتھ اہل ازبک کی ضیافتوں کی نذر کیا جاسکتا ہے ؎

غریبِ شہر تو فاقے سے مر گیا لیکن
امیرِ شہر نے کھا کھا کے خودکشی کرلی!

معمہ غالب اُردو اسکول کا

تاشقند کے مرزا اسد اللہ اسٹریٹ پہ واقع مرزا غالب اردو اسکول کی بابت پڑھ رکھا تھا، جہاں ازبک بچوں کو اردو زبان کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سوچا چلو دیارِ غیر میں رہنے والوں کی زبان سے اُردو سنتے ہیں۔ کیوں کہ پورے شہر میں کوئی اردو کیا روسی و ازبکی کے علاوہ کوئی اور زبان جاننے والا ہمیں نہ ملا تھا، وہ تو نصیب سے ہمیں ایک عربی داں سٹوڈنٹ مل گیا جس کی وجہ سے سیاحت و زیارت کا مرحلہ بآسانی طے ہوگیا اور بہت سے نامور شیوخ سے ملاقات کی راہ نکل آئی؛ ورنہ قومی زبان سے ناآشنائی نہ معلوم ہمیں کس کس آزمائش سے گزارتی!۔

بہرحال! اردو زبان کی محبت ہمیں کشاں کشاں کھینچے مرزا اسد اللہ اسٹریٹ کی طرف لے گئی؛ مگر تلاشِ بسیار کے باوجود ہمیں ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' کے مصداق کچھ ہاتھ نہ آیا۔ مرزا اسد اللہ اسٹریٹ کے ساتھ مرزا غالب محلہ اور عالی شان مرزا غالب جامع مسجد بھی موجود تھی؛ لیکن اردو کے اسکول کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہ ملا۔ ہم نے ایک معمر شخص سے اس بابت دریافت کیا تو اس نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔

جنھوں نے اس اسکول کی بابت لکھا ہے ہم ان کے ساتھ کسی طرح کی بدگمانی نہیں رکھتے، بلکہ حسن ظن کی بنیاد پر تطبیق کی صورت یہ نکالتے ہیں کہ ممکن ہے وہاں کسی دور میں مرزا غالب اردو اسکول قائم ہوا تھا، اور کچھ سال چلا بھی ہو؛ مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ملنے کے باعث اسے بند کردینا پڑا ہوا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

گویا مجھ سے پہلے جو لوگ اس اسکول میں پہنچے وہ اس کا موسم بہار تھا اور ہم بخت کے مارے اس وقت پہنچے جب اسکول خزاں دیدہ ہوچکا تھا۔ یہ باتیں میں نے یہاں قصداً اس لیے لکھ دیں کہ کوئی میری ہی طرح آشفتہ سر اردو کی محبت میں اگر وہاں جانے کا آرزومند ہو تو میرے تجربے سے فائدہ اٹھا کر خود کو کئی طرح کے آزار سے آزاد رکھ سکے۔

مرزا غالب محلہ تاشقند یونیورسٹی کے قریب ہی ایک کشادہ وخوبصورت علاقے میں واقع ہے۔ مرزا غالب کو چوں کہ ازبک ہونے پر بڑا فخر ہوا کرتا تھا؛ اسی لیے اہلِ ازبک نے اس کی یاد تازہ کرنے کے لیے مسجد و محلہ کو ان سے معنون کردیا، جو آج بھی ان کے نام سے موجود ہے۔ آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ مرزا غالب کے آباؤاجداد اصلاً ازبک تھے۔ ان کے دادا مرزا قوقان بیگ سلجوقی ترک تھے، جو احمد شاہ کے دورِ حکومت میں سمرقند سے ہجرت کرکے واردِ ہندستان ہوئے تھے۔ لاہور، دہلی اور جے پور میں ملازمت کی اور بالآخر آگرہ میں مستقلاً فروکش ہو گئے، جہاں مرزا غالب ۲۷؍ دسمبر ۱۷۹۷ء میں واردِ جہانِ رنگ و بو ہوئے تھے۔

ہندوستان یا ہندِستان

طاشقند کے ایک ریسٹوران میں ایک صاحب نے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے تعلق رکھتے ہیں؟ ہم نے بتایا ہندوستان سے، تو کہنے لگے، نہیں ہندِستان سے۔ یہاں

ہر کوئی ہندِستان ہی بولتا ہے، پھر باتوں ہی باتوں میں انھوں نے عربستان بھی استعمال کیا۔ ان کی یہ بات دل کو لگی ہے، اور پھر ہمیں یاد آیا کہ ہم نے بھی کئی مصری و عربی کو الھند یا ہندِستان ہی کہتے سنا ہے، اور بعض قدیم کتب میں بھی یہی پڑھا ہے؛ بلکہ اس تعلق سے ایک بار ہم نے فیس بک پر پوسٹ بھی لگائی تھی تو بیشتر احباب کا اس تعلق سے مثبت تبصرہ نظر نواز ہوا تھا۔

پوسٹ کچھ یوں تھی : ایک بات بہت دنوں سے میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں جتنے "ستان" موجود ہیں قریبا سبھی ماقبل مکسور ہیں مثلاً افغانِستان، پاکِستان، تتارِستان، ازبکِستان، کردِستان، کرغِستان، داغِستان، قازقِستان، بلوچِستان، اور ترکمانِستان وغیرہ، تو آخر ہندوستان یا ہندُستان ماقبل مضموم کیوں؟ کیا اُسی قاعدہ سے اِسے ہندِستان نہیں ہونا چاہیے۔ عربی میں اسے ہند کہا ہی جاتا ہے۔

مجھے دراصل 'ہندو'ستان لکھنا اور پڑھنا بڑا بھاری لگتا ہے، اور میں نے ہمیشہ ہندِستان ہی لکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں دونوں طرح پڑھے جانے کی گنجائش ہوتی ہے؛ لیکن ہندوستان لکھنے کی صورت میں تلفظ متعین ہوجاتا ہے۔

اب اس سلسلے میں اگر کوئی علامہ اقبال کی مشہورِ زمانہ نظم پیش کرے کہ انھوں نے تو ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' لکھا ہے تو احباب ذی وقار! آپ بتائیں کہ اگر شعری ضرورت کے تحت بہت کچھ گرایا اور لگایا جاسکتا ہے تو نثر کی بھی تو اپنی کچھ ضرورتیں ہیں، جن کا بہرحال خیال رکھا جانا چاہیے!۔

اس کا ایک سائڈ افیکٹ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس نام سے شہ پاکر بعض متعصّبین اب اسے باضابطہ ''ہندوستھان'' لکھنے لگے ہیں۔ لہٰذا معاصر ارباب علم و دانش اگر متفقہ طور پر ہندو کے "و" کا تختہ یکسر اُلٹ دیں اور دیگر ستانوں کی طرح

وطن عزیز کو بھی حرفاً و صوتاً ہندِستان سے تعبیر کرنا شروع کریں تو یہ آئین کی خلاف ورزی کے زمرے میں بھی نہیں آئے گا؛ کیوں کہ دستورِ ہند میں جا بجا لفظ بھارت یا انڈیا استعمال کیا گیا ہے۔ ہاں! متعصبین کے منہ پر ایک زناٹے دار طمانچہ ضرور ہوگا، مستزاد یہ کہ پاکستان کے ساتھ مماثلت بھی ہوجائے گی؛ کیوں کہ روس جو اپنے آپ کو سُپر پاور کہلاتا تھا، جب بکھراؤ کا شکار ہوا تو اس کے اتنے اِستان بنے کہ شاید دنیا کا کوئی ملک ٹوٹ کر اتنے حصوں میں بٹا ہوگا، اور ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ بھی خود کو کسی سپر پاور سے کم باور کرانے پر رضا مند نہیں، لہٰذا ہندوستان سے 'و' کو گرا کر اس کی حیثیتِ واقعی کی یاد دلاتے رہنا بھی ہمارے لیے ضروری ہے۔ تاہم اس تعلق سے حقِ اختلاف غیر محفوظ ہے!۔

بات ایک عشائیے کی

اس سفر میں کئی عشائیے اور کئی ظہرانے ملے؛ لیکن ہر دعوت یکساں کہاں، بعض ضیافتیں یادگار بن جاتی ہیں، انھیں میں سے ایک آج کی ضیافت بھی تھی۔ آج کا عشائیہ دراصل شیخ ڈاکٹر حسن خان یحییٰ عبدالمجید اَندیجانی کے درِ دولت پہ تھا۔ شیخ یحییٰ ازبکستان کے چنندہ علما و عمائدین میں سے ایک ہیں۔ حکومت میں ان کا اثر ورسوخ بہت گہرا ہے، عوام کے دلوں پر حکمراں ہیں، نیز شہر کے احوال و آثار پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ قرطاس و قلم سے اٹوٹ رشتہ ہے، ان کی چھوٹی بڑی کئی کتابیں عربی وازبک میں طبع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔

ہم حسبِ وعدہ شیخ کے دولت کدے پر پہنچے، دستر خوان چنا ہوا تھا، میوہ جات کی پیالیاں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں، اور قہوہ کا دور چل رہا تھا۔ میز کے ارد گرد قریباً دس بارہ اربابِ علم ودانش تشریف رکھتے تھے۔ شیخ نے پرتپاک انداز میں استقبال کیا اور

بڑی عزتوں سے نوازا۔ پھر ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔

شیخ نے جلد ہی میرا مزاج سمجھ لیا، اور چند ثانیے میں بے تکلفی سے باتیں ہونے لگیں۔ یہ وہ دستر خوان تھا جس سے ہند و عرب کے نامی علما و افاضل اپنا نصیب چن چکے تھے۔ ایک ماہ قبل ہی لکھنؤ کی ایک مشہور علمی شخصیت اسی مقام پر موجود تھی، جن کے اَحوال شیخ حظ لے لے کر مجھ سے بیان کر رہے تھے۔ پھر اچانک موضوع بدلا اور ہندستان میں **مسلکی** آویزش کے تعلق سے مجھ سے استفسار کرنے لگے۔

تعارفِ امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ

میں نے شیخ عبد الحیٔ رائے بریلوی کی نزہۃ الخواطر سے بات شروع کی اور کھینچ کر تاجدارِ بریلی تک لے آیا۔ کہنے لگے سنا ہے کہ مولانا احمد رضا بریلوی کی تحریروں میں بڑی شدت تھی اور فتویٔ کفر لگانے میں جری تھے۔ میں نے کہا آپ کے دستر خوان نے اَب تک جنھیں خوراک فراہم کی، وہ بدقسمتی سے مولانا احمد رضا خان سے فی سبیل اللہ بیر رکھنے والے لوگ رہے ہوں گے؛ ورنہ جو اُن کے بڑے ہیں وہ امام احمد رضا محدث بریلوی کے علمی تفوق کا قصیدہ پڑھ چکے ہیں، اور آج بھی ان کی علمی حیرانگی کا تشفی بخش جواب مولانا احمد رضا خان کے تحقیقی اِفادات ہی سے انھیں ملتا ہے۔

اُن کے ایک مشہور محدث و مصنف نے لکھا ہے کہ ''جب بندہ ترمذی شریف اور دیگر کتب احادیث کی شروحات لکھ رہا تھا تو حسب ضرورت احادیث کی جزئیات دیکھنے کی ضرورت در پیش آئی تو میں نے شیعہ حضرات، اہل حدیث حضرات اور دیوبندی حضرات کی کتابیں دیکھیں؛ مگر ذہن مطمئن نہ ہوا۔ بالآخر ایک دوست کے مشورے سے مولانا احمد رضا خان کی کتابیں دیکھیں تو میرا دل مطمئن ہوگیا کہ اب بخوبی احادیث کی شروح بلا جھجھک لکھ سکتا ہوں''۔

اور خود صاحب نزہۃ الخواطر کے مقدمہ نگار فاضل بیٹے شیخ علی میاں ندوی نے برملا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ''فقہ حنفی اور اس کی جزئیات پر جو عبور مولانا احمد رضا خان کو حاصل تھا، اس زمانہ میں اس کی نظیر نہیں ملتی!۔

میں نے کہا: ڈاکٹر صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے مولانا احمد رضا خان کو صرف دوسروں کی زبان سے سنا ہوگا یا دوسروں کی کتابوں میں پڑھا ہوگا، تو وہ ہنسنے لگے۔ میں نے عرض کی: برائے کرم مولانا احمد رضا خان کی براہِ راست تحریریں پڑھیے، فکرِ رضا سے شناسائی حاصل کیجیے اور ان کے فقہ وحدیث کے تعمق کو ماپیے تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا احمد رضا خان کس جینئس انسان کا نام ہے، اور وہ شدت برتتے تھے تو کس کے ساتھ، اور فتویٰ کفر لگاتے تھے تو کس پر؟!۔ مولانا کی شخصیت اس شعر کی مصداق تھی ؎

پتھر مجھے کہتا ہے ہر اک دیکھنے والا!
میں موم ہوں تم نے کبھی چھو کر نہیں دیکھا

یقین مانیں میرے امام کی تحریریں پھول کی پنکھڑیوں کی طرح نازک اور ریشم کی مانند ملائم ہیں؛ اسی لیے عشق رسولِ مقبول ﷺ کا دم بھرنے والوں کے مشامِ جان وایماں کے لیے وہ عطر مجموعہ کا کام دیتی ہیں اور ان کے فکری واعتقادی دکھوں کا مداوا و مسیحائی کرتی ہیں۔

میں نے کہا قبلہ! امام احمد رضا محدث بریلوی کی علمی تحقیقات، فقہی انتاجات اور قلمی فتوحات کو دیکھیں گے تو ایسا لگے گا جیسے اسلافِ اُمت کا کوئی کارواں گزر رہا تھا اور مولانا احمد رضا ان کے ساتھ چلتے چلتے پیچھے رہ گئے۔

دیدہ وروں نے یوں ہی تو نہیں کہہ دیا: لو رآها أبوحنيفة النعمان لأقرت

عینہ۔ یعنی اگر مولانا احمد رضا کو امام ابو حنیفہ دیکھ لیتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں اور انھیں اپنے اصحاب میں شامل کر لیتے۔

آتی ہی رہے گی ترے اَنفاس کی خوشبو
گلشن تری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب! لگائی بجھائی پر کان دھرنے والے اکثر ادراکِ حقیقت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس لیے مولانا کی تحریروں میں جھانک کر ان کے علمی خدوخال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا امام بڑا مظلوم رہا ہے، اسے غیروں نے بھی ستایا اور اپنوں نے بھی اس کے ساتھ بیگانوں کا سا سلوک روا رکھا؛ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ علم و فقہ اور حکمت و دانش کی محفلیں محدثِ بریلوی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتیں اور جب تک اس کائنات میں علم و فن اور دین و دانش کے زمزمے بلند ہوتے رہیں گے، یہ فرہادِ کمال بھی زندہ و پائندہ رہے گا!۔

شیخ نے اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ہاں! مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندستان کی سرزمین پر نابغۂ روزگار علما و فقہا موجود رہے ہیں؛ لیکن ان سے استفادے کے دائرے نہایت محدود ہیں۔ آج دنیا نیٹ پر سمٹ آئی ہے۔ ہر کوئی دین و دنیا کے مسائل کی تحلیل کے لیے اس سے مدد لیتا ہے؛ لیکن جب مسائل دینیہ اور فتاویٰ جات کے تعلق سے نیٹ پر کچھ سرچ کیا جائے تو سب سے پہلے عرب کے سلفیوں وہابیوں کے آرا و فتاوے دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے؛ اس لیے علماے ہند کی نگارشات و تحقیقات اور ان کے فتاوی جات عربی و انگریزی میں نیٹ پر اپلوڈ کرنا وقت کی اوّلین ضرورت ہے؛ کیوں کہ فہم مزاج شرع کے حوالے سے جو گہرائی و گیرائی، نکات آفرینی، اور ملکۂ استنباط فقہاے ہند کے ہاں ملتا ہے وہ دوسروں کے ہاں مفقود ہے۔

اُردو ایک باثروت زبان

پھر بتایا کہ چند سال قبل یہاں کے ایک بزرگ متبحر عالم صحاحِ ستہ کی شروحات پر کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اور انھوں نے خاصا کام کر بھی لیا تھا۔ جب مجھے علم ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ آپ اُردو زبان بھی سیکھ لیں، تاکہ صحاحِ ستہ کی جو اُردو شروحات ہیں ان کے اسرار و معارف کو بھی اپنی تحقیقات میں شامل کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے زبان سیکھی اور تکمیل کے بعد اقرار کیا کہ یقیناً میری شروحات اردو شرحوں سے استفادے کے بغیر بہت ہی ادھوری رہ جاتیں!۔

اُزبکستان کے اوّلین سرکاری مفتی

پھر شیخ نے روسیوں کے مظالم اور کمیونسٹوں کی چوطرفہ تباہ کاریوں کی دردناک روداد سنائی اور کہا کہ ان سب کے باوجود کچھ مردانِ خدا نے ہتھیار نہ ڈالے اور تہ خانوں میں نسلوں کے ایمان کی پرورش کرتے رہے اور ایک ایسی جماعت تیار کر ڈالی جو باطل کی فصیلوں پر شب خون مارنے میں طاق تھی۔ چنانچہ انھیں میں سے ایک میرے استاد و مربی شیخ محمد صادق علیہ الرحمہ بھی تھے، جنھیں رب کریم نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ ازبکستان کے اوّلین مستقل سرکاری مفتی تھے۔ ان کی مصنفات کی تعداد سو جلدوں سے متجاوز ہے۔ جن میں ان کی تفسیر ہلال چھ جلدوں میں، شرح الاحادیث النبویہ کی انتالیس مجلدات، التربیۃ الروحیہ کی تین جلدیں، شرح الادب المفرد کی چار جلدیں اور شرح الحکم العطائیہ کی پانچ جلدیں روسی و ازبکی زبان میں بہت زیادہ مشہور و مقبول ہیں۔

شیخ اپنے فکر و اعتقاد میں اتنے متصلب تھے کہ انھوں نے کبھی باطل سے سمجھوتا نہیں کیا، اور روس کی ایک عالمی کانفرنس میں جہاں لب کشائی کی اچھے اچھوں کو جرأت نہ ہوتی تھی، آپ نے برملا اپنے موقف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ازبکستان

میں جو مدارس و مساجد بند ہیں یا پابندیوں کے حصار میں ہیں، انھیں از جلد تعلیم و عبادت کے لیے کھول دیا جائے؛ ورنہ ملک میں پھیلنے والی ابتری کی ذمہ دار حکومت ہوگی!۔

شیخ کے کہنے کا ایسا اثر ہوا کہ اسی وقت تعلیم گاہوں اور عبادت کدوں سے پابندی ہٹادی گئی اور آج چند دہائیوں کے بعد ازبک اپنے وفکری دیوالیے پر قابو پانے میں بہت حد تک کامیاب ہوچکا ہے۔ اس وقت بحمداللہ شیخ محمد نور الدین خالق نظر مفتیِ ازبکستان ہیں، اور بہت عمدہ کام کررہے ہیں، ان کی علمی سرپرستی سے ہم بڑے پُرامید ہیں کہ از جلد تلافیِ مافات کی کوئی موثر سبیل نکل آئے گی باذن اللہ!۔

شیخ محظوظ ہوہوکر ساری باتیں بتارہے تھے اور ہم سراپا حیرت واشتیاق بنے سماعت کر رہے تھے۔ پھر حکم ہوا کہ آپ مہمان شیخ ہیں، موجودین کو اپنے ناصحانہ کلمات سے نوازیں۔ چنانچہ قریباً نصف گھنٹہ ہم نے عربی زبان میں خطاب کیا اور وقفے وقفے سے شیخ سامعین کے لیے اس کا ازبک میں ترجمہ کرتے جارہے تھے۔

سلسلۂ کلام جاری ہی تھا کہ ڈشیں آنا شروع ہوگئیں تو میں نے کہا شیخ حکم یہ ہے کہ إذا حضر العِشاء والعَشاء فبادر إلى العَشاء۔ تو جب کھانے کی وجہ سے نماز کو موخر وموقوف کر دینے کا حکم ہے تو پھر سلسلۂ کلام کی کیا مجال کہ وہ کھانے کے سامنے جاری رہ سکے!۔ شیخ مسکرائے اور پھر ہم لذتِ کام ودہن سے محظوظ ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔ قسما قسم کی ڈشیں سامنے موجود تھیں، ابھی اس کا عُشرِ عَشِیر بھی ختم نہ ہوا ہوگا کہ مزید ڈشیں آگئیں۔ گوناگوں پکوان دیکھ کر میں نے کہا: شیخ! ہم نے ہند کے مدارس میں اہل علم کی زبانی ''خلطِ مبحث'' کی ایک اصطلاح سنی تھی؛ لیکن آج اُزبکی پکوان دیکھ کر لگتا ہے کہ ''خلطِ مطبخ'' کی بھی ایک اصطلاح ہونی چاہیے!۔

یہ سن کر شیخ کھلکھلا کر ہنسے اور پھر گویا ہوئے کہ مولانا! ابھی آپ نے دیکھا کہاں ہے، دل تھام کے بیٹھیے اب اصل ڈش آنے والی ہے!۔ پھر واقعتاً ڈشوں کی ایسی

برسات ہوئی کہ خوانِ پُرنعمت پر انچ بھر جگہ بھی نہ بچی!۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ زندگی بھر ایک ڈیڑھ روٹی کھانے والا ان ڈھیر ساری ڈشوں سے بھلا کتنا خوراک اندوز ہو سکتا تھا، چنانچہ ہم نے معذرت کرلی اور کہا کہ شیخ! دنیا میں کچھ لوگ کھانے کے لیے جیتے ہیں اور کچھ لوگ بس جینے کے لیے کھالیتے ہیں، افسوس کہ ہمارا تعلق موٴخرالذکر گروہ سے ہے!۔

شیخ مسکرائے اور پھر گوناگوں قسم کے فروٹ چینی تھالیوں میں سجا دیے گئے۔ ابھی چند قاشیں ہی نہ اٹھی تھیں کہ مختلف قسم کے میٹھے سامنے آ گئے۔ میں نے دل میں کہا: واقعی اہلِ ازبک کی ضیافت بے مثال، حیران کن اور جذباتی بنا دینے والی ہے۔

مجھے کچھ ہی دیر میں سمرقند و بخارا کے لیے شدِ رحال کرنا تھا؛ اس لیے دبے لفظوں شیخ سے اجازت لی اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیخ نے اپنی حالیہ مجلد مطبوعہ کتاب 'التبیان فی بعض تراجم و أسانید قراء ازبکستان' پیش کی۔ یاد آیا کہ دلائل الخیرات کا ایک نسخہ گاڑی میں پڑا ہوا ہے۔ منگواکر میں نے شیخ کی نذر کردیا۔ قبولیت کے ہاتھوں لینے کے بعد شیخ نے اسے دیکھا، پھر سندِ متصل کی آرزو ظاہر کی۔ اور پھر ہم اِذن لے کر سمرقند کے لیے کوچ کر گئے۔

اُزبکستان کی تاریخ

یہ بھی ایک قدیم ترین خطہ رہا ہے؛ لیکن ساتویں صدی عیسوی میں ماوراء النہر کہے جانے والے اس علاقے میں سب سے بڑا انقلاب اس وقت آیا جب عرب مجاہدین نے یہاں اسلام کا پرچم لہرایا اور یوں یہ علاقہ اسلام کے زیرِ آغوش آگیا۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ خلافتِ عباسیہ کے زیرِ حکومت تھا اور یہی زمانہ تعلیم اور ثقافت کا سنہری دور مانا جاتا ہے۔ پھر ترکوں نے شمال کی جانب سے علاقے میں دخل اندازی شروع کی اور کئی ایک نئے صوبے آباد کیے۔ انھوں نے ایران اور خوارزم کے علاقے کو ملا کر ماوراء النہر کو ایک بڑے صوبے میں منتقل کر دیا جس کی

سرحدیں بحیرۂ ارال کے جنوب تک پھیل گئیں۔

صدیوں کے دوران اُزبکستان کی ثقافت پر بہت سی قوموں نے گہرا اثر ڈالا ہے۔ کئی مشہور فاتحین اور اُن کی فوجیں اِس کے شہروں پر قبضہ کرنے کے لیے اِس کے پہاڑی اور ریگستانی علاقوں سے گزریں۔ اِن فاتحین میں سکندرِ اعظم شامل تھے، جنھوں نے یہاں کی ایک مقامی لڑکی رُخسانہ سے شادی کی۔ منگولیا سے تعلق رکھنے والے چنگیز خان نے بھی اِس علاقے پر قبضہ کِیا۔ اور بعد میں امیر تیمور نے اِس علاقے کو زیرِ نگیں کرلیا۔

1991ء میں ازبکستان کی سوویت نے سوویت اتحاد سے آزادی کا اعلان کر دیا اور اسلام کریموف آزاد ازبکستان کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ پھر اس نے اپنا نیا اسلامی دستور تشکیل دیا؛ کیوں کہ سوویت اتحاد کے تمام ممالک میں مارکس اور لینن سے متاثر دہریت کا بول بالا تھا۔ سوویت نے ایک اصطلاح رائج کی تھی جسے گوساٹیزم (gosateizm)کہتے تھے۔ یہ گوسیودارستوو (gosudarstvo) یعنی ریاست اور الحاد(atheism) کا مرکب ہے۔

اس کا مقصد ریاست میں دہریت کو فروغ دینا، مذہب کے خلاف تعلیمی مواد چھاپنا اور نشر کرنا، نظامِ تعلیم میں مذہب کے خلاف تدریسی مواد فراہم کرنا اور مذہبی نشانات کو ختم کرنا تھا۔ 1980ء کی دہائی تک سوویت مذہب کے اثر کو ماند کرنے میں کامیاب رہا، بایں طور کہ مساجد اور مدارس مقفل کر دیے گئے، مذہبی متون اور تعلیمات پر پابندی لگادی گئی، مذہبی رہنماؤں کو مقید کر دیا گیا؛ لیکن سوویت کا یہ افیون دیرپا ثابت نہ ہوا؛ لوگ جلد بیدار ہو گئے اور اپنی دیرینہ اسلامی روایات کو سینے سے لگالیا۔

یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں جب اِسلامی فوجوں نے ملک پر فتح حاصل کی تو عربی زبان کو فروغ دیا، اور صدیوں اس کا راج رہا۔

لیکن جب اُزبکستان 'سوویت یونین کا حصہ بنا تو شروع میں رومن رسم الخط کا اِستعمال کِیا گیا؛ لیکن 1930ء کے دہے کے آخر تک اِس کی جگہ سیرِلک رسم الخط اِستعمال کِیا جانے لگا۔ پھر 1993ء میں ایک نئے آئین کے مطابق اُزبک حروفِ تہجی متعارف کرائے گئے جو رومن رسم الخط پر مبنی ہیں۔

سمرقند و بخارا کی آفاقیت

سمرقند و بخارا دراصل ترکستان و ماوراء النہر کے درمیان واقع دو عظیم تاریخی شہر ہیں، جن سے مسلمانوں کے تمدن و عظمت کی بہت سی ناقابلِ فراموش یادیں وابستہ ہیں۔ یہ دونوں اسلامی تاریخ کے آغاز ہی سے اہمیت کے حامل مقام رہے ہیں۔ سمرقند حکومت و سلطنت کے اعتبار سے اور بخارا علم و فضل کی حیثیت سے تاریخِ عالم میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ بعض سیاحوں نے سمرقند و بخارا کو 'مزارات' کا شہر قرار دیا ہے؛ کیوں کہ اس سرزمین میں عالمی شہرت یافتہ بزرگانِ دین، علماے ربانیین اور صحابۂ کرام کے مزارات موجود ہیں؛ اسی لیے اس زمین کو 'روحانی سرزمین' بھی کہا جاتا ہے۔

بلاشبہہ یہ اہل اللہ کی سرزمینیں ہیں۔ صدیاں اس کے علمی و روحانی فیوض و برکات سے متمتّع ہوتی رہی ہیں۔ اربابِ عشق و ادب نے ہر دور میں اپنا آہوے شوق اس سمت ہنکایا ہے، اور مقصود آشنا و مراد رسا ہوئے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو اہل اللہ کے مزارات و مقابر سے بے پرواہانہ گزر جاتے ہیں اور انھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آج یہ جو گنبدِ بلند نظر آرہا ہے اس کے سایے میں آرام گزیں کون ہے؟۔

کاش! انھیں کوئی بتا دیتا کہ اپنی صفات کی دھنک اور اپنے کردار کی خوشبو مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، جن مزاروں پر خوشبو اور چراغ ہو، ان صاحبانِ مزار

کی زندگی نیکی اور خیر کی زندگی ہوگی۔ جن لوگوں کے مزار پر گنبد نظر آتے ہیں، وہ لوگ زندگی میں ہی غبارِ راہِ حجاز ہو چکے ہوتے ہیں، اور ان کی آنکھوں میں خاکِ مدینہ و نجف کا سرمہ لگ چکا ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ موجودہ ازبکستان ہی قدیم زمانے میں ماوراء النہر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ افغانستان اور وسط ایشیا کے درمیان میں دریاے جیحون بہتا ہے؛ اس لیے اہلِ ہندو پاک اس علاقے کو ''دریا پار'' کہتے ہیں اور عربی میں اسے ماوراء النہر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وادیِ فرغانہ و نمنگان

وادیِ فرغانہ کی اپنی ایک سنہری اور انوکھی تاریخ ہے، جس کی کوکھ سے شہنشاہ تیمور گورگانی (م۸۰۷ھ) جیسا امیر عالَم پیدا ہوا، اور کئی ملکوں میں اپنے جلال و جبروت کا سکہ جما کر راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ یہیں پر مقامِ نمنگان سے فاتحِ اعظم ظہیر الدین محمد بابر (م۹۳۶ھ) بھی اُٹھا، جس نے ہندِستان میں سلطنت مغلیہ کی بنا گزاری اور کئی نسلوں تک اس کا خاندان یہاں سریر آراے تخت رہا۔ مسلمانوں کی اقبال مندی کے دنوں میں بعض نہایت مشہور باکمالوں پر یہ خطہ بھی نازاں تھا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (مدفون دہلی) خطۂ اوش کے اور خواجہ کمال ؒ خجند کے مایۂ فخر تھے۔

یہیں سے منہاج السراج نکلے اور ہندستان کی مشہور تاریخ کی کتاب طبقاتِ ناصری لکھ ڈالی۔ یہیں قاآنی نے اپنے مشہور قصائد قلم بند کیے، جن کی موسیقی آبشاروں کے ترنم سے زیادہ فردوسِ گوش ہے۔ اسی سے متصل مرغینان نامی ایک شہر ہے، جہاں سے دنیاے فقہ کا آفتاب (علامہ مرغینانی) طلوع ہوا اور عالم اسلام کو ''ہدایہ'' کا نور دے کر واصلِ حق ہوگیا۔

نمنگان تاشقند سے پانچ سو میل دور ازبکستان کے آخری سرے پر واقع ہے، یہ مرکزیت کا حامل شہر ہے۔ یہاں بھی کسی دور میں خوب علمی چہل تھی، آج بھی اس کے کچھ اثرات دکھائی دیے۔ کثرتِ مساجد و مدارس کی وجہ سے اچھا دینی ماحول بن گیا ہے۔ باپردہ خواتین یہیں زیادہ دکھیں، بقیہ خطوں میں مغربی تہذیب کا مکمل عکس نظر آیا۔ نمنگان دریاے سیر کے کنارے پر آباد ہے۔

دریا کے دوسرے کنارے پر سلطان بابر کے والد عمر شیخ مرزا کا تاریخی قلعہ ہے، جہاں بابر کا جنم ہوا تھا۔ بابر ابھی عمر کی ساتویں بہاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ پانی کی کاٹ سے قلعہ کی دیوار گری اور اس کے والد دریا بُرد ہو گئے۔ سیر اور کار دونوں دریا نمنگان کے قریب ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں، گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیر اور کارا کی وادی میں پرورش پانے والا مغل شہزادہ گنگا اور جمنا کی وادیوں کا تاجدار بن کر ابھرا۔

تاتاری مغلوں کے کارنامے پڑھ کر یہ باور کرنا بالکل مشکل نہیں ہوتا کہ شجاعت و بسالت گویا انھیں آغوشِ مادر ہی سے مل جاتی ہے اور وہ عزم و جواں مردی کے کوہِ ہمالہ ہوتے ہیں، جدھر رخ کرتے ہیں فتح و ظفر قدموں میں سمٹ چلی جاتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن سے نکل کر ماوراء النہر، ایران اور خراسان وغیرہ ممالک میں جس طرف گئے فتح و بربادی ان کے ہم رکاب رہی۔ دریاے والگا سے لے کر سندھ اور آبرودِ گنگا تک چنگیز خان اور امیر تیمور کی تلوار سے کہیں پناہ نہیں تھی۔ نیشا پور اور جرجانیہ کے مثل بہت سے شہر اس سیلِ تاتار میں ایسے بہے کہ اب بعضوں کے کھنڈر بھی شاید ڈھونڈے سے نہ ملیں!۔

ہم جب عجوبۂ روزگار بنے!

یہاں لباس کے تعلق سے ایک دلخراش بات قلم بند کردینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ قزاق و ازبک میں قیام کے دوران ایک چیز بڑی عجیب و غریب دیکھنے میں آئی کہ ہندو پاک وغیرہ میں اہل علم جو لباس زیبِ تن کرتے ہیں خواہ وہ کرتا پاجامہ ہو یا جبہ و عبایا، وہ ازبک خواتین و حضرات کے لیے کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ اس قسم کا لباس وہاں بزرگ و معمر خواتین کے لیے خاص ہے؛ لیکن علم نہ ہونے کی وجہ سے انھیں پہن کر ہم بھی چند روز تک لوگوں کے لیے سامانِ استعجاب بنے رہے، اور جس راہ سے گزر جاتے لوگ کنکیوں سے ایک دوسرے کو لباس دیکھنے کے لیے اِشارے کرتے، اور من ہی من میں مسکراتے جاتے!۔

میں پہلے ان کی سادہ لوحی پہ مسکرایا اور پھر ان کے مسکرانے پر مجھے رونا آیا؛ کیوں کہ ان اللہ کے بندوں کو پتا نہیں کہ وہ ایسا کچھ اشتراکیت کی مرعوبیت کی وجہ سے کر رہے ہیں، کمیونزم کی ستر سالہ محنتوں کا تمغہ ہے ان کا نیم عریاں پوشاک اور فرنگی لباس۔ آج ان کے قلب و نظر میں اس لباس کو ایسا رچا بسا دیا گیا کہ عفت و حیا والے لباس آج انھیں باعثِ تضحیک اور سامانِ تمسخر لگنے لگے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ائمہ و علما بھی ٹھاٹ سے پینٹ شرٹ ہی پہنے نظر آئے اور جبہ و دستار کی ان کے ہاں کوئی وقعت نہیں!۔

حالاں کہ وہاں کے ایک میوزیم میں آج بھی قدیم سمرقند و بخارا کے مدرسے کے طلبہ و اساتذہ کا ایک یادگار فوٹو آویزاں ہے، اور بعض پرانے علما کے پاس بھی موجود ہے، جس میں صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ چھوٹے بچے سے لے کر مدرسہ کے ناظم و مہتمم تک سب کے سب مسنون لباس میں سر پر عمامہ سجائے کھڑے ہیں۔

یہ دراصل کمیونسٹوں کا اہل ازبک کے لیے آخری تحفہ تھا کہ انھوں نے علما و طلبہ

کو ایک جگہ کھڑا کر کے ریکارڈ میں رکھنے کی غرض سے ان کی تصویر بنائی تھی؛ تاکہ اُمتِ مسلمہ دیکھ لے کہ کبھی یہ کیا تھے اور آج ہم نے انھیں کیا بنا دیا ہے!۔ سچ ہے کہ ؎

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا

مدرسے بقاے اِسلام کے ضامن!

آج جب ہندِستان کے مدارس پر چاروں طرف سے خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں اور حکومتِ وقت اپنی آمریت کے نشے میں ہر حد سے گزر جانے پر تلی ہوئی ہے تو اس وقت میری نگاہوں کے سامنے سمرقند و بخارا اور قرطبہ و غرناطہ کے مدارس و مکاتبِ دینیہ کے ساتھ ہونے والے اشتراکی اور صلیبی مظالم کا سارا نقشہ گھوم رہا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جن ملکوں میں مدارس کو ختم کر دیا گیا وہاں سے اسلام مٹا تو نہیں کہ اسلام مٹنے کے لیے نہیں آیا، ہاں! اسلام بس براے نام رہ گیا، اور پھر اس کی عظمت و شوکتِ پارینہ بحال کرنے میں کئی دہائیاں صرف کرنی پڑیں۔ اسلامی دنیا کے بعض خطوں میں کھیلے گئے اس کامیاب کھیل کو اب بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ ہندِستان میں کھیلنے کی منظم کوشش ہو رہی ہے۔ تانا بانا تیار ہو چکا ہے، بس کوئی وقت جاتا ہے کہ ناانصافیوں کے درجنوں داغدار فیصلے کرنے والی ہماری عدلیہ اس کھیل کو کھیلنے کا بھگوا ئیوں کو جواز فراہم کر دے۔

مایوسی و دل سوزی کے اس ماحول میں مجھے علامہ اقبال یاد آ گئے، جنھوں نے بڑی دردمندی سے اہلِ اسلام کو مخاطب کر کے کبھی کہا تھا کہ :

''ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ مُلا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اگر ہندستانی مسلمان ان مدرسوں کے اَثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ و قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمرا کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ (یاد رکھنا اگر یہ مدرسے مٹ گئے تو) ہندستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا''۔

فالامان والحفیظ۔ (اوراقِ گم گشتہ، از رحیم بخش شاہین بحوالہ چراغِ راہ، ص: ۹۲)

شاہراہِ ریشم کی تاریخ

دائرۃ المعارف اردو کے مطابق "عہدِ قدیم (Ancient Ages) کے ان تجارتی راستوں کو مجموعی طور پر شاہراہ ریشم اور انگلش میں Silk Road یا Silk route کہا جاتا ہے جو چین کو ایشیاے کوچک اور بحیرۂ روم کے ممالک سے ملاتے ہیں۔ یہ گزرگاہیں کل 8 ہزار کلومیٹر پر پھیلی ہوئی تھیں۔

شاہراہ ریشم کی تجارت چین، مصر، بین النہرین، فارس، برصغیر اور روم کی تہذیبوں کی ترقی کا اہم ترین عنصر تھی اور جدید دنیا کی تعمیر میں اس کا بنیادی کردار رہا ہے۔ شاہراہ ریشم کی اصطلاح پہلی بار جرمن جغرافیہ دان فرڈیننڈ وون رچٹوفن نے 1877ء میں استعمال کی تھی۔ اب یہ اصطلاح پاکستان اور چین کے درمیان زمینی گزرگاہ شاہراہ قراقرم کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

مغرب سے شمالی چین کے تجارتی مراکز تک پھیلی یہ تجارتی گزر گاہیں سطح مرتفع تبت کے دونوں جانب شمالی اور جنوبی حصوں میں تقسیم ہیں۔ شمالی راستہ بلغار قپچاق علاقے سے گذرتا ہے اور چین کے شمال مغربی صوبے گانسو سے گذرنے کے بعد مزید تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، جن میں سے دو صحرائے ٹکلا مکان کے شمال اور جنوب سے گذرتے ہیں اور دوبارہ کاشغر پر آ کر ملتے ہیں، جب کہ تیسرا راستہ تین شان کے پہاڑوں کے شمال سے طرفان اورالماٹے سے گذرتا ہے۔ یہ تمام راستے وادی فرغانہ میں خوقند کے مقام پر ملتے ہیں اور مغرب میں صحرائے کراکم سے مرو کی جانب جاری رہتے ہیں اور جہاں جلد ہی جنوبی راستہ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔

ایک راستہ آمو دریا کے ساتھ شمال مغرب کی جانب مڑ جاتا ہے جو شاہراہ ریشم پر تجارت کے مراکز بخارا اور سمرقند کو استراخان اور جزیرہ نما کریمیا سے ملاتا ہے۔ یہی راستہ بحیرۂ اسود، بحیرۂ مرمرہ سے بلقان اور وینس تک جاتا ہے، جبکہ دوسرا راستہ بحیرۂ قزوین اور قفقاز کو عبور کر کے جارجیا سے بحیرۂ اسود اور پھر قسطنطنیہ تک پہنچتا ہے۔

شاہراہ ریشم کا جنوبی حصہ شمالی ہند سے ہوتا ہوا ترکستان اور خراسان سے ہوتا ہوا بین النہرین اور اناطولیہ پہنچتا ہے۔ یہ راستہ جنوبی چین سے ہندوستان میں داخل ہوتا ہے اور دریائے برہم پترا اور گنگا کے میدانوں سے ہوتا ہوا بنارس کے مقام پر جی ٹی روڈ میں شامل ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں یہ شمالی پاکستان اور کوہ ہندو کش کو عبور کر کے مرو کے قریب شمالی راستے میں شامل ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں یہ راستہ عین مغرب کی سمت اپنا سفر جاری رکھتا ہے اور شمالی ایران سے صحرائے

شام عبور کرتا ہوا لیونت میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں سے بحیرۂ روم میں بحری جہازوں کے ذریعے سامان تجارت اٹلی لے جایا جاتا تھا، جبکہ شمال میں ترکی اور جنوب میں شمالی افریقہ کی جانب زمینی قافلے بھی نکلتے تھے۔

تا بخاکِ سمر قند

مشہورِ عالم شہر 'سمرقند اسی شاہراہِ ریشم پر قائم ہے۔ اس کے ایک طرف زر افشاں دریا ہے اور تین اطراف سے تینَ شیئَن پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ پہاڑ کے درے میں سے گزر کر شہر میں داخلے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ یہ شہر اپنی تہذیب ثقافت اور جدت کی وجہ سے کبھی مشرق کا روم کہلاتا تھا۔ ۱۴۱۴ء صدی عیسوی میں امیر تیمور نے اس شہر کو اپنی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا، اور اسے ایسی عروسانہ سج دھج عطا کی کہ نئی نویلی دولہن کا حسن بھی اس کے سامنے پھیکا پڑ جائے!۔

امیر تیمور کے انتقال کے قریباً سو سال بعد مغل حکمران ظہیر الدین محمد بابر جب سمرقند میں داخل ہوا تو یہ شہر اپنی ماضی کی دلکشی و رعنائی بھی کھو چکا تھا؛ لیکن بابر نے اپنی کتاب تزکِ بابری میں شہر کا جو حال لکھا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

> 'سمرقند کی مشہور ترین عمارات میں امیر تیمور کا محل ہے جو ارک سرائے کے نام سے مشہور ہے۔ محل کے بعد یہاں کی جامع مسجد اول درجے کی ہے۔ اس کے پیش طاق پر لکھی ہوئی آیت کریمہ ''وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْراھِیمُ الْقَوَاعِدَ'' اس قدر جلی حروف میں ہے کہ ایک کوس سے پڑھی جاسکتی ہے۔ امیر تیمور کے بنائے ہوئے دو باغ بھی سمرقند کے عجائبات میں سے ہیں'۔

'شاہِ زندہ' کے زیر سایہ

سمرقند پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے عم زادۂ پیغمبر، ہم شبیہ حبیبِ داور حضرت سیدنا قثم بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں حاضری کا قصد کیا۔ دنیا جہان کے زائرین وعاشقین فیض یابی کے لیے یہاں حاضر تھے۔ آپ پہلی صدی کے نصفِ اول میں بغرضِ تبلیغ اور برائے اعلاے کلمۃ اللہ یہاں تشریف لائے اور ہزاروں کو مشرف باسلام کرکے کفار کے ہاتھوں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ آپ وہ جلیل القدر صحابی ہیں جنھیں سیدعالم نورِ مجسم ﷺ کی خدمت کرنے کے ساتھ انھیں لحدِ مبارک میں اُتارنے کا شرف حاصل تھا۔ نیز آپ صورت وسیرت دونوں میں پیغمبر اعظم ﷺ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔

آپ سیدنا عباس اور اُم الفضل لبابۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہما کے نورِ نظر اور جلیل القدر صحابی رسول تھے۔ علمی اِعتبار سے آپ کا شمار ممتاز صحابہ میں ہوتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کو نیچے کھیلتے ہوئے دیکھا تو بڑی شفقت سے اٹھایا اور اپنی سواری کے پیچھے بٹھا لیا۔ آپ شہیدِ کربلا سیدنا امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے رضاعی بھائی بھی تھے کہ آپ کی والدہ نے انھیں دودھ پلایا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ مکہ معظمہ کی وہ خوش نصیب خاتون تھیں جنھیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے فوراً بعد مشرف باسلام ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ گویا خواتین میں اسلام لانے میں ان کا دوسرا نمبر ہے۔

نبی کریم ﷺ کی ظاہری وفات کے وقت آپ کسی حد تک سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے، چنانچہ سید کونین ﷺ کے غسلِ میت اور تجہیز و تکفین میں آپ شریک تھے اور غسل دیتے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جسد اطہر کو کروٹیں بدلا کرتے

تھے۔ آپ قبر انور میں اتارنے کے لیے بھی اترے تھے اور جسدِ مبارک کو فرشِ خاک پر لٹانے کے بعد سب سے آخر میں قبر انور سے باہر نکلے۔ بعض راوی یہ آخری شرف حضرت مغیرہ بن شعبہ کی طرف منسوب کرتے ہیں؛ لیکن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ یہ آخری شرف حضرت قثم کو حاصل ہوا۔

خلافتِ علی المرتضیٰ کے زمانے میں آپ نے بڑے کارنامے انجام دیے۔ شیر خدا کے ساتھ کئی ایک جنگوں میں مردانہ وار شریک ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو مکہ مکرمہ کا والی و امیر بھی بنایا، بلکہ آپ کے ایام ولایت کے دوران ہی سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شہادت کا واقعہ بھی پیش آیا۔

پھر خلیفۃ المسلمین سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اخیر دورِ خلافت میں آپ حضرت سعید بن عثمان رضی اللہ عنہما کے ساتھ معرکۂ خراسان کے لیے نکلے، اور وہیں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ۵۷ھ میں مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

مؤرخین نے لکھا کہ اولادِ عباس میں ایک سے بڑھ کر ایک مجاہدین گزرے ہیں، ہر چند کہ ان کی ماں اُم الفضل نے انھیں ایک گھر کے اندر جنم دیا تھا؛ لیکن ان کی قبریں ایک دوسرے سے جتنی دوری پر واقع ہیں، شاید ہی ایسا کہیں بھائیوں کی قبروں کے درمیان بُعد دیکھا گیا ہو!۔ حضرت فضل رضی اللہ عنہ اجنادین میں شہید ہوئے ــــــ معبد و عبد الرحمن رضی اللہ عنہما افریقہ میں آرام فرما ہیں ــــــ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ طائف میں استراحت گزیں ہیں ــــــ حضرت عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن میں مدفون ہیں ــــــ اور حضرت قثم رضی اللہ تعالیٰ عنہ خاکِ سمرقند میں پیوست ہیں۔ امام حاکم نیساپوری نے بھی آپ کی قبر کے سمرقند میں ہونے کی تصدیق کی ہے۔

(تفصیل کے لیے البدایۃ والنہایۃ، الاصابہ فی تمیز الصحابہ اور تاریخ طبری وغیرہ دیکھیں)

ایک پہاڑی کے اوپر واقع آپ کا مقبرہ یہاں **''شاہ زندہ''** کے نام سے مشہور ہے۔ وہیں سیڑیوں کے بغل میں دو رویہ قبوں کے اندر بہت سے مشاہیرِ وقت بھی آرام گزیں ہیں۔ ان مقبروں کا طرزِ تعمیر خاص طور پر آرٹس وکندہ کاری اور خوش نویسی قابل دید ہے۔ مقبرے کے تہ خانے میں ایک بڑا متبرک چلہ خانہ ہے، جہاں کبھی اعاظمِ تصوف حضرت بایزید بسطامی اور ابوالحسن خرقانی علیہما الرحمہ وغیرہ مُراقب ہوئے تھے، اور آج بھی انوار و تجلیات کی وہاں بارشیں ہورہی ہیں۔

پہاڑی پر شاہِ زندہ کے مزار تک لے جانے والی بہت بڑی اور چوڑی سیڑھیوں کے حوالے سے یہاں مشہور ہے کہ چڑھتے اترتے وقت گنی جانے والی سیڑیوں کی تعداد اگر برابر نہ نکلے تو سمجھیں بندہ گنہ گار ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ غالباً یہ چھتیس سیڑیاں ہیں۔ ہم جب احاطۂ شاہ زندہ کے اندر پہنچے تو انوار و تجلیات کی ایسی کہکشائیں نظر آئیں کہ سیڑیوں کو شمار کرنے کا خیال ہی ذہن سے محو ہوگیا۔ اور ویسے بھی ہم کہاں نیکو کاروں میں تھے جو سیڑیوں کی تعداد کی برابری ہماری بے گناہی کی تصدیق کرتی!۔ بس اللہ لطف وکرم کا معاملہ فرماتا رہے!!۔

خیر! جب ہم شاہِ زندہ کے سامنے کھڑے ہوئے تو ایک رعب کی سی کیفیت بدن پر طاری ہوگئی۔ دیر تک عالم خیال میں آپ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کی ہجرتِ مبارکہ کے بارے میں سوچتا رہا کہ اسلام و مسلمین کے لیے ان صحابہ وتابعین کی قربانیاں کتنی گراں قدر ہیں کہ اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے سب کچھ چھوڑ کر وادیِ کفر میں بہزار خندہ پیشانی اُتر جاتے تھے اور ان کے پاک انفاس کی برکتیں کفر کی شبِ تیرہ سے نیرِ ایمان کو اُجال دیا کرتی تھیں۔

پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک صاحب قرآن کی تلاوت سے سامعین کو محظوظ کر رہے

تھے۔ میرے دل میں بھی آرزو جاگی کہ کاش! اس مقامِ فیض نشان پر تلاوتِ قرآن کا موقع مل جائے۔ ابھی دل کی بات زبان پر بھی نہ آسکی تھی کہ ایک نمنگانی شیخ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ قرآن پڑھیے۔ جب میں نے تلاوت شروع کی تو گنبد سیمیں سے ٹکرا کر فضا کو مسحور کردینے والا منظر عجیب ہوگیا۔ اور میں اسی کیف و وجد کے ساتھ تصور کا سہارا لے کر چودہ صدیاں قبل جاکر قرآن کے نغمۂ لاہوتی سے خود کو دیر تک مسحورِ لذت کرتا رہا۔

پھر جب اسے پتا چلا کہ میں ہندستانی ہوں تو اس نے صلاۃ وسلام کی اِستدعا کی۔ میں نے کہا کہ آج سلامی اسی مقام پر پڑھی جائے گی جہاں کبھی جنید وبایزید جیسے عرفاے حق مراقب ہوا کرتے تھے۔ پھر ہم نے ہندی لَے میں یا نبی سلام علیک پڑھ کر ماحول کو مزید گرما دیا، اور فیض وکرم کی ایسی برکھا برستی دیکھی کہ وہ منظر پھر کسی اور مقام پر دیکھنے اور محسوس کرنے کو نہ ملا۔

اِسلام کریموف کی قبر پر

وہاں سے نیچے اتر کر ہم نے نمازِ مغرب پڑھی، اور پھر سابق صدر اسلام کریموف کے عجوبۂ روزگار میوزیم کی طرف آنکلے۔ یہ کوئی کئی ایکڑوں کا قبرستان ہوگا، جس کے وسط میں شاہِ زندہ آرام فرما ہیں، اطراف میں عامۃ المسلمین کی قبریں ہیں اور پھر مغربی سمت کے کنارے پر تربتِ صدر واقع ہے۔ یہاں جب ہم پہنچے تو وقت چھ سے زیادہ ہوجانے کی وجہ سے صدر گیٹ بند ہوچکا تھا، کیوں کہ زائرین کو اجازت بس چھ بجے تک ہی ہے؛ لیکن پھر اچانک سیکورٹی کو کیا سوجھی کہ اس نے گیٹ کھول کر کہا کہ آئیے بالائی حصے پر چلیے اور پھر اس نے مجھے اسلام کریموف کے سرہانے پر لاکر کھڑا کردیا اور کہا: قرآن کی تلاوت کیجیے۔

میں نے موقع غنیمت جانا اور قرآن مقدس کی تلاوت شروع کی، سارے سیکوریٹی یکے بعد دیگرے جمع ہوگئے۔ پھر اجتماعی دعا خوانی ہوئی، اور دیر تک ان لوگوں نے میرے ساتھ یادگار تصویریں لی اور عزتوں کے ساتھ وہاں سے رخصت کیا۔ اسی سے متصل مسجدِ خضر واقع تھی؛ لیکن اس کی بلندی اتنی تھی کہ ہم چڑھنے کی ہمت نہ کرسکے اور نہ وقت میں اتنی گنجائش ہی تھی!۔

عجوبۂ روزگار مسجد بی بی خانم

ایک اوور برج پار کرکے ہم مسجد بی بی خانم کے پاس پہنچ گئے۔ رات کا منظر تو ویسے ہی بڑا سہانا اور دل فریب ہوتا ہے، پھر اس مسجد کے در و بام کا حسن ہمیں اپنی گرفت میں لیے جا رہا تھا۔ داخلی راستے کی بلندی چالیس میٹر سے کم نہ رہی ہوگی جو دیکھنے والے پر ایک ہیبت طاری کردیتی ہے۔ یہ مسجد بلا مبالغہ عجوبۂ روزگار اور ازبکستان کی تاریخی مساجد میں سے ایک تھی۔ اس کی دیو ہیکل دیواریں، آسمان سے بات کرتی محرابیں اور تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا فرش نگاہوں کے لیے سرمے کا کام کر رہا تھا۔ دیواروں پر آیتوں کی ترقیم کا اپنا ہی ایک انداز تھا، نقش و نگار کی یہ دنیائیں اور ترقیمے کا یہ انداز شاید ازبکیوں ہی سے شروع ہوکر انھیں پر ختم ہوگیا۔

انھیں کی سرزمین سے اٹھنے والے ایک فاتح نے اہل ہند کو بھی ایسی بہت سی نعمتوں اور برکتوں سے آشنا کردیا؛ ورنہ کفرستانِ ہند میں کیا چیز دیکھنے اور سر دھننے کی تھی!۔ یہ تاج محل، لال قلعہ، قطب مینار، مقبرۂ ہمایوں، شاہی جامع مساجد اور ارضِ ہندوپاک پر بکھری بہت سی مغلیہ عمارتیں سب انھیں کے تو باقیاتِ خالدات ہیں۔

مسجد بی بی خانم کے بالکل سامنے آپ کا مقبرہ بھی واقع ہے۔ ساری عمارتیں مغلیائی طرز کی ہیں اور ہر ایک کا انداز یکساں ہونے کے باوصف یک گونہ جداگانہ

ہے۔ اس میں تعمیر و تزئین سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تکنے کے درجنوں زاویے ہیں۔ یہاں پر تاریخی مقامات جب سے حکومت کی تحویل میں گئے ہیں، ہرچند کہ دیکھ ریکھ اور مرمت تو بہت شاندار ہوگئی ہے؛ لیکن ہر پوائنٹ کا ٹکٹ بہت مہنگا ہے، جو زائر کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

جب ہم مقبرۂ بی بی خانم پر پہنچے تو سیکیوریٹی نے ٹکٹ لینے کے لیے کہا، ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ اس سے کہو ہم ٹورسٹ نہیں ہیں، قرآن کی تلاوت کرنے کے لیے آئے ہیں، اس کے علاوہ ہمارا کوئی اور مقصد نہیں، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اتنا کہنے سے وہ مان جائے گا، مگر قربان جاؤں، اتنا سننے کے بعد وہ سُن ہوگیا اور بولا کہ قرآن کی تلاوت کا ہم کون ہوتے ہیں چارج کرنے والے!، بلکہ یہ تو سعادت کی بات ہے، اور پھر وہ خود آکر شریکِ سماعتِ تلاوت ہوگیا۔ اس کے بعد یہ ترکیب پھر کئی زیارتوں پر کامیاب رہی؛ لیکن کافی دیر سے سوجھی؛ ورنہ خاصی رقم بچانے میں ہم کامیاب ہوجاتے!، بہر حال!جو گیا وہ بھی کسی اچھے مدہی میں لگا ہوگا!۔

امام بخاری علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں

رات کافی ڈھل چکی تھی، تھکاوٹ بھی شباب پر تھی؛ اس لیے سمرقند کی دیگر زیارتیں کوتاہ کرتے ہوئے بلکہ وعدۂ فردا پر ٹالتے ہوئے ہم اپنی خواب گاہ کی طرف لوٹ گئے اور سرِ صبح سیدنا امام بخاری علیہ الرحمہ کی تربتِ انور کی زیارت کے لیے نکل پڑے؛ کیوں کہ مقبرۂ امام بخاری شہر سے قریباً بائیس کلومیٹر دور جانب مغرب میں واقع ہے۔ یہ علاقہ خرتنگ کہلاتا ہے، راستے میں دریاے زرافشاں کی لہروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم اچھے وقت پر وہاں پہنچ گئے۔

ہر چند کہ امام بخاری نے بخارا میں شرفِ تولد حاصل کیا، جو کہ بہت ہی قدیم شہر ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ یہ حضرت عیسیٰ کی ولادت سے تین صدی قبل ہی سے موجود رہا ہے۔ مختلف مذاہب کے پیرو کار یہاں آکر آباد ہوتے رہے اور اپنی تہذیب و تمدن کا غازہ اس کے چہرے پر ملتے رہے۔ اس کی اسلامی فوجی فتح مشہور عرب جرنیل قتیبہ بن مسلم باہلی (م۹۵ھ) کے ذریعہ آٹھوی صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی، جب کہ مذہبی فتح اسے حضرت قثم بن عباس اور سعید بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ذریعہ ساتویں صدی کے اواخر ہی میں مل چکی تھی۔

بخارا دینی علوم و فنون کے ساتھ سائنسی تجربات وانکشافات کا بھی مرکز رہا ہے۔ اس لیے اسے بغداد کا ہم پلہ بھی مانا گیا ہے۔ یہاں سامانی سلاطین کے کتب خانے بڑے مشہور رہے ہیں، جن میں پچاسوں ہزار نادر و نایاب کتب و مخطوطات موجود تھے۔ جہاں وقت کے جید علما و فضلا اور چوٹی کے محققین اپنی علمی تشنگی بجھانے جاتے تھے۔ ابن سینا نے یہیں ارسطو کا اولین عربی ترجمہ کیا، پھر کتاب القانون لکھی جسے آج تک علم طب کی دنیا میں انسائیکلوپیڈیائی حیثیت حاصل ہے۔

امام بخاری شہر بخارا میں ۱۹۴ھ کو رونق افزاے عالم ہوئے اور وہی ان کی علمی زندگی کا مستقر رہا۔ ہر چند کہ آپ نے تلاشِ حدیث میں مشاہیر ممالکِ اسلامیہ کا چکر لگایا، فرامینِ پیمبر کی برکتیں لٹانے کے لیے آپ نے متعدد مدارس کا رخ کیا، زندگی مختلف موڑ پر آپ کے حلقوم سے تلخ و شیریں جام اُتارتی رہی، اور آپ اپنوں کے شیوۂ وفا کے ساتھ غیروں کا سلوکِ جفا بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے، بالآخر ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'' کے مصداق سمرقند کے ایک مضافاتی قصبہ خرتنگ میں پیمانۂ زندگی لبریز ہو گیا اور وہیں آپ کا مقبرہ زیارت گاہِ خلائق ہے۔

تدفین کے بعد اگر آپ کی قبرِ مبارک سے کئی دن تک خوشبو کی لپٹیں مشامِ جانِ عالم کو معطر کرتی رہیں تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جس نے زندگی کا لمحہ لمحہ تتبعِ حدیث میں گزار دیا ہو، کتابتِ حدیث میں انوکھے اہتمام کی روایت قائم کی ہو اور جس سے نوے ہزار تلامذہ نے اکتسابِ فیض و نور کیا ہو اس کے وجودِ باجود سے خوشبوئیں ہی تو پھوٹیں گی اور اس کی تربتِ اقدس سے انوار و برکات کے نفحات ہی تو اٹھیں گے!۔

جمالِ ہم نشیں در من اَثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

یعنی میرے دوست کا جمال پورے طور پر میرے اندر سما گیا ہے؛ ورنہ میری حیثیت تو وہی مٹی والی ہے!۔

آج دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا کلمہ گو ہو جو صحیح بخاری کی عظمت و کرامت کا قائل نہ ہو۔ قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب ہونے کا اعزاز اسی کو تو حاصل ہے۔ ایک سو سے زائد شروح و حواشی اور تعلیقات و تجریدات اس کی معرضِ وجود میں آچکی ہیں، جن میں سب سے زیادہ فتح الباری شہرت پذیر ہوئی۔ ایک ہزار سے زائد اساتذہ و محدثین سے آپ نے اخذِ فیض کیا اور جمعِ حدیث کی ایسی انوکھی خدمت انجام دی کہ بارہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی آپ کی علمی شخصیت کا سورج ٹھیک نصف النہار پر کھڑا ہے، ہر مسلک و مذہب آپ کی عظمت و شوکت کا معترف و مداح ہے اور آپ کی تصنیف لطیف سے مشرقین و مغربین اپنی قسمت چمکا رہے ہیں۔

بخاری شریف کی قراءت کی اپنی ہی برکتیں ہیں، رحمتِ حق دست گیری فرماتی ہے، فتوحات کے نئے در وا ہوتے ہیں اور مختلف مقاصد و مراد میں کامیابی ملتی ہے۔

واقعتاً بخاری پڑھنے پڑھانے کا الگ ہی لطف ہے۔ اور پھر جب بخاری کی قراءت امام بخاری کی تربت کے سامنے کی جائے تو سمجھ سکتے ہیں کہ برکت وکرامت کی دنیا میں کیسی ہلچل مچ جاتی ہوگی!، اور رحمتِ مولا کس درجہ قاری پر مہربان ہوتی ہوگی!!۔

مرقد بخاری ہی سے متصل ایک معرض القرآن اور معہد الحدیث ہے، جہاں مختلف ممالک کے مطبوعہ قرآن کے نفیس نسخے رکھے ہوئے ہیں، اوراحادیث نبویہ پر ریسرچ کے ساتھ طلبہ کو حدیثیں یاد کرائی جاتی ہیں۔

امام بخاری کمپلیکس کی تعمیر جدید

جیسے ہی ہم مقبرۂ بخاری پر پہنچے، بڑے بڑے کرین اور آلاتِ تعمیر کو دیکھ کر کچھ حیران سے ہوئے کہ یا اللہ! اتنا لمبا سفر طے کرکے آج بارگاہِ بخاری میں پہنچے، اور یہاں تعمیر وتوسیع کا کام چل رہاہے، نہ معلوم حاضری کی کیا ترکیب بنے گی!۔ ابھی ہم اسی شش وپنج میں تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا، شکل سے عالم معلوم ہوتا تھا، پوچھا کہ ہندی ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا، تووہ بہت خوش ہوا، پھر عربی میں دیر تک وہاں کے منصوبے بیان کرتا رہاکہ پہلے یہاں صرف امام بخاری کا مقبرہ تھا اور کچھ جزوی دینی سرگرمیاں تھیں؛ مگراب پورا بخاری کمپلیکس تیار ہورہاہے، جس میں دار القرآن، دار الحدیث، دار التحقیق، دار الترجمہ، دار الطباعۃ والتوزیع اور امام بخاری میوزیم وغیرہ کی بہاریں اور برکتیں شامل ہوں گی۔

میں نے پوچھا آپ کون ہیں؟ تو بتایاکہ ہم اس کمپلیکس کے انچارج ہیں۔ پھر ہم اس کی مہربانی سے ایک بیرونی راستے سے مقبرۂ امام بخاری کی طرف گئے، اور بہت قریب سے فاتحہ خوانی کی برکات وسوغات حاصل کیں۔ بخاری شریف کی حدیث اول

و آخر پڑھی اور دیر تک مراقب رہ کر خوشبوے حدیث کو پھیلانے کی بارگاہِ خداوندی سے بھیک مانگتے رہے۔ ارادہ تھا کہ بارگاہِ امام میں خاصا وقت دیا جائے گا؛ لیکن توسیع کے بکھیڑے ایسے پھیلے ہوئے تھے کہ توجہ کو یکسو رکھنا ایک چیلنج بنا ہوا تھا۔

پھر وہ ہمیں اپنی کار میں لے کر زیر تکمیل مختلف پروجیکٹ دکھانے نکلے۔ مسجد بخاری میں بھی گئے، وجیہ و شکیل چہرے بشرے والے صوفی امام سے بھی ملاقات کی، جنھوں نے چند باتیں کر کے ہی ہمیں اپنا گرویدہ بنالیا۔ اخیر میں ہم معہد الحدیث گئے، جہاں جامعہ ازہر کے موقر اساتذہ طلبہ کو درسِ بخاری دے رہے تھے۔ دخل در درس کو میں نے مناسب نہ سمجھا، لیکن آنجناب ایک درسگاہ میں لے کر پہنچ ہی گئے۔ شیخ نے پرتپاک استقبال کیا اور بتایا کہ اہلِ ہندوپاک کا صحیح بخاری کے ساتھ اعتنا لائق تحسین و تقلید ہے۔ کہنے لگے کہ چند سال قبل ہند کے ایک شیخ آئے ہوئے تھے جنھیں پوری بخاری یاد تھی اور اس کا بیشتر حصہ انھوں نے طلبہ کے سامنے پیش بھی کیا۔ غالباً یہ کیرلا کے شیخ عبدالرحمن مسلیار تھے۔

مجھ سے بھی کچھ نصیحت کے لیے کہا، تو چند حدیثیں براے حصولِ برکت ہم نے طلبہ کے سامنے رکھیں، اور اس کے فوائد بیان کیے، پھر اجازت لے کر واپس ہو گئے۔ ہم نے انچارج کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا، اور پھر بادیدۂ نم خرتنگ سے نکل کر بارِ دیگر زرافشاں کی بپھری موجوں کے نظارے کرتے ہوئے سمرقند پہنچ آئے۔

امیر تیمور کے مقبرہ پر

اب ہم سمرقند کی بقیہ زیارات کے لیے نکلے۔ پہلے گورِ امیر پہنچے، جہاں تیمور جیسا فاتح عالم اپنے شیخ و مربی کے قدموں میں اپنے خاندان کے چیدہ افراد کے ساتھ تہِ

سنگ مرمر سویا ہوا تھا۔ فیروزی رنگ کے گنبد والا یہ عالیشان مقبرہ تیمور نے اپنے پوتے محمد سلطان کی وفات پر تعمیر کروایا تھا؛ لیکن اسے کیا پتا تھا کہ چند سال بعد وہ خود بھی اسی مقبرے کا حصہ بن جائے گا۔ بے بسی کے ایسے مناظر چشمِ عالم نے کم دیکھے ہوں گے کہ ایک وقت تھا جب سلطنتِ تیموریہ کا ڈنکا شرق و غرب میں بج رہا تھا اور آج بیالیس ملکوں کا فاتح زیرِ زمین سویا ہوا ہے۔

کچھ تیمور کی بابت: ترک منگول قبیلے برلاس سے اٹھنے والا امیر تیمور تیموری سلطنت کا بانی اور تاریخ عالم کا ایک عظیم جنگجو حکمران تھا۔ چنگیز خان کے خاندان سے اس کا قریبی تعلق تھا۔ وہ دریائے جیحوں کے شمالی کنارے پر واقع شہر سبز میں 1336ء میں پیدا ہوا۔ بلا کا ذہین تھا، دس سال کی عمر میں حافظ قرآن بن گیا۔ ایک اچھا سپاہی ہونے کے ساتھ بے مثل سپہ سالار تھا۔ اپنی ذاتی قابلیت کو بروے کار لاتے ہوئے ترکستان اور موجودہ افغانستان کے بڑے حصے پر قابض ہونے کے بعد 1366ء میں بلخ کا تخت نشین ہوا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے صاحبِ قِران کا لقب اختیار کیا۔

(علوم نجوم کی رو سے صاحبِ قِران وہ شخص کہلاتا ہے جس کی پیدائش کے وقت زہرہ اور مشتری یا زحل اور مشتری ستارے ایک ہی برج میں ہوں۔ ایسا شخص اقبال مند، بہادر اور جری سمجھا جاتا ہے، مجازاً اپنے دور کا عظیم ترین حکمران۔ ہندستان میں غالباً بادشاہ شاہ جہان کے لیے یہ لقب استعمال ہوتا تھا)

تیمور نے اپنی زندگی میں بیالیس ممالک فتح کیے۔ وہ دنیا کے چند نادر ترین لوگوں میں سے ایک تھا۔ تیمور کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ بیک وقت اپنے دونوں ہاتھوں سے کام لے سکتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں تلوار اُٹھاتا اور دوسرے ہاتھ

میں کلہاڑا۔

بلخ کی تخت نشینی کے بعد تیمور نے ان تمام علاقوں اور ملکوں پر قبضہ کرنا اپنا حق اور مقصد قرار دیا جن پر چنگیز خان کی اولاد حکومت کرتی تھی۔ اس غرض سے اس نے فتوحات اور لشکر کشی کے ایسے سلسلے کا آغاز کیا جو اس کی موت تک پورے 37 سال جاری رہا۔ تیمور کے ابتدائی چند سال چغتائی سلطنت کے باقی ماندہ حصوں پر قبضہ کرنے میں صرف ہو گئے۔ اگلے چند سالوں میں اس نے کاشغر، خوارزم، خراسان، ہرات، نیشاپور، قندھار اور سیستان فتح کر لیا۔ 1386ء میں اس نے ایران کی مہم کا آغاز کیا جو "یورش سہ سالہ" کہلاتی ہے اور اس مہم کے دوران ماژندران اور آذربائیجان تک پورے شمالی ایران پر قابض ہو گیا۔ اس مہم کے دوران اس نے گرجستان پر بھی قبضہ کیا۔

روس کی مہم سے واپسی کے بعد تیمور نے 1392ء میں ایران میں نئی لشکر کشی کا آغاز کیا جو "یورش پنج سالہ" کہلاتی ہے۔ اس مہم کے دوران اس نے ہمدان، اصفہان اور شیراز فتح کیا۔ آل مظفر کی حکومت کا خاتمہ کیا اور بغداد اور عراق سے احمد جلائر کو بے دخل کیا۔ اس طرح وہ پورے ایران اور عراق پر قابض ہو گیا۔ تیمور ایران کی مہم سے فارغ ہو کر ابھی تبریز واپس ہی آیا تھا کہ اس کو اطلاع ملی کہ تختمش نے دربند کے راستے پر حملہ کر دیا ہے۔ تیمور نے دریائے تیرک کے کنارے 18 اپریل 1395ء کو تختمش کو ایک اور شکست فاش دی؛ کیوں کہ 1391 میں وہ ایک بار اسے ناکامی کی دھول چٹا چکا تھا۔ اس کے بعد تیمور نے پیش قدمی کر کے سیر اوردہ کے دار الحکومت سرائے کو تباہ و برباد کر دیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس مہم کے دوران تیمور استراخان، ماسکو، کیف اور کریمیا کے شہروں کو فتح کرتا اور تباہی پھیلاتا ہوا براستہ قفقاز، گرجستان اور تبریز 798ھ میں سمرقند واپس آ گیا۔

1398ء میں تیمور ہندوستان کو فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا۔ ملتان اور دیپالپور سے ہوتا ہوا دسمبر 1398ء میں دہلی فتح کر لیا۔ پھر وہاں سے میرٹھ گیا جہاں دریائے جمنا کی بالائی وادی میں ہندوؤں کے مقدس مقام ہردوار میں لوگوں کو شکست دیا۔ اس جگہ تیمور کو اپنی سلطنت کی مغربی سرحدوں سے تشویشناک خبریں ملیں۔ احمد جلائر سلطان مصر کی مدد سے پھر بغداد واپس آگیا تھا اور اس کے اور قرہ یوسف ترکمان کے ورغلانے سے عثمانی سلطان بایزید یلدرم ان سب کے ساتھ مل کر تیمور کے خلاف محاذ بنا رہا تھا، چنانچہ تیمور فوراً سمرقند واپس ہوا۔

1399ء میں وہ سمرقند سے اپنی آخری اور طویل ترین مہم پر روانہ ہوا۔ تبریز پہنچ کر اس نے سلطان مصر کے پاس سفیر بھیجے جن کو قتل کر دیا گیا، چنانچہ تیمور سلطان مصر کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا، جو احمد جلائر کی مدد اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ حلب، حماہ، حمص اور بعلبک کو فتح کرتا ہوا دمشق پہنچا اور حسب دستور لوگوں کا قتل عام کیا اور شہر میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد وہ بغداد آیا لیکن احمد جلائر اس کے بغداد پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

پھر 1402ء میں تیمور نے عثمانی سلطان بایزید یلدرم کو جنگ انقرہ کو شکست فاش دی۔ مصر کے مملوک سلطان کو جب اطلاع ملی کہ تیمور نے بایزید جیسے طاقتور حکمران کو شکست دے کر گرفتار کر لیا تو سفیر بھیج کو تیمور کی اطاعت قبول کر لی۔ مصر میں تیمور کے نام کا سکہ ڈھالا اور مکہ اور مدینہ میں اس کے نام کا خطبہ پڑھنے کا حکم دیا۔

سمرقند واپس آنے کے بعد تیمور نے چین پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ چوں کہ چین بھی ایک زمانے میں چنگیز خان کی اولاد کے قبضے میں رہ چکا تھا، اس لیے تیمور اس پر بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ تیمور کفارانِ چین کے خلاف جہاد

کر کے اس خونریزی کی تلافی کرنا چاہتا تھا جس کا شکار صرف مسلمان ہوئے تھے۔ سردیاں بالکل شباب پر تھیں، منجمد سیر دریا کو پار کر کے جب وہ اترار پہنچا تو اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور اسی جگہ 18 فروری 1405ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش سمرقند لا کر دفنائی گئی۔ لڑائیوں میں زخم کھانے کی وجہ سے تیمور کا دایاں ہاتھ شل ہو گیا تھا اور دائیں پاؤں میں لنگ تھا؛ اس لیے مخالف مورخین اس کو حقارت سے تیمور لنگ لکھتے تھے۔

ہر چند کہ امیر تیمور چنگیز خان کی اخلاف میں تھا؛ لیکن فتوحات کی کثرت میں وہ اپنے مورثِ اعلیٰ سے بھی چند قدم آگے تھا۔ فتوحات کی وسعت کے لحاظ سے تیمور کا شمار سکندر اعظم اور چنگیز خان کے ساتھ دنیا کے تین سب سے بڑے فاتح سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔

چنگیز کے مفتوحہ علاقوں کا طول مشرق سے مغرب تک بہت زیادہ تھا؛ لیکن شمالاً و جنوباً عرض تیمور کے مقابلے میں کم تھا۔ پھر چنگیز خان کی سلطنت کا ایک بڑا حصہ اس کے سپہ سالاروں نے فتح کیا تھا، جب کہ تیمور دہلی سے ازمیر تک اور ماسکو سے دمشق اور شیراز تک ہر جگہ بنفسِ نفیس گیا اور ہر جنگ میں بذاتِ خود شرکت کی۔ گو کہ چنگیز خان جنگ کی منصوبہ بندی میں مشہور تھا؛ لیکن میدانِ جنگ میں فوجوں کو لڑانے کے سلسلے میں تیمور اپنی مثال آپ تھا۔ ۱۳۹۳ء میں کلات اور تکریت کے ناقابلِ تسخیر پہاڑی قلعوں کی تسخیر اس کی اس خداداد صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

تیمور کے بعد اس کے جانشیں شاہ رخ نے تیموری سلطنت کو اس کے عروج پر پہنچا دیا۔ لیکن پھر 1507ء میں شیبانی خان نے ہرات پر قبضہ کر کے وسط ایشیا میں تیموری اقتدار کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔

شاہ رخ بھی اپنے والد کے بغل میں مدفون ہے۔ وہیں تیمور کا پوتا الغ بیگ بھی لیٹا ہوا ہے، جس کے سائنسی نظریات نے دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ گور امیر کے اس چھوٹے سے گنبد کے نیچے وسیع و عریض سلطنت کا حکمران اپنی تین نسلوں سمیت چند مربع گز کی جگہ میں سویا ہوا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا احساس یہاں اس شدت سے ہوا کہ دل دہل گیا۔ سچ ہے کہ ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے ۔۔۔ یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے! ۔۔۔ زمیں کھا گئی پہلواں کیسے کیسے!

خواجہ عبیداللہ احرار علیہ الرحمہ کے دربارِ شاہی میں

یہاں سے فراغت کے بعد ہم سلسلہ نقش بندیہ کے رفیع المرتبت بزرگ خواجہ عبیداللہ احرار ولی علیہ الرحمہ کی زیارت کے لیے نکلے۔

ماہِ رمضان ۸۰۶ھ میں باغستان توران مضافاتِ تاشقند میں متولد ہوئے۔ بچپن ہی سے آثارِ رشد و ہدایت اور انوارِ قبول و عنایت آپ کی پیشانی سے نمایاں تھے۔ آپ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے نیرِ تاباں، سید الاحرار، عارف باللہ، عاشقِ رسول اللہ، صاحبِ معارفِ و اسرار اور مادرزاد ولی کامل تھے۔ خاندانی لحاظ سے بھی آپ کا تعلق ایک علمی و روحانی خانوادے سے تھا؛ لیکن آپ ہمارے زمانے کے اخلاف کی طرح ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ نہ لگاتے تھے بلکہ علم و عمل، تقویٰ و فضیلت کے اعلیٰ معیار پر فائز تھے۔ آپ کا لقب ''احرار'' ہے۔ اس لقب میں آپ کی بڑی منقبت ہے کیوں کہ اہل اللہ کے نزدیک حر (واحد؛ احرار) اُسے کہتے ہیں، جو عبودیت کی حدود کو بدرجۂ کمال قائم کرے، اور ماسوی اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جائے۔

بچپن ہی سے اہل اللہ سے سچی عقیدت تھی۔ کم سنی میں ہی مزاراتِ مشائخ پر حاضر ہوتے۔ جب سن بلوغ کو پہنچے تو طاشقند کے مزارات پر روزانہ حاضری دیتے۔ حضرت خواجہ عبیداللہ احرار خواجہ یعقوب چرخی قدس سرہ العزیز کی خدمت سے رخصت ہو کر پھر ہرات میں آئے اور کم و بیش ایک سال وہاں رہے۔ انتیس سال کی عمر میں اپنے وطن کی طرف واپس آئے، اور طاشقند میں مقیم ہو کر اپنے معاش کے لیے زراعت کا کام شروع کیا اس کام میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی، اور آپ کے ہاں مال و متاع، جانور و مویشی، اور اجناس وغیرہ کی فراوانی ہوگئی۔ یوں بظاہر آپ کی زندگی شاہانہ تھی؛ لیکن یہ سب کچھ درویشوں کی خدمت اور فقرا کے لیے تھا۔

مولانا عبدالرحمن جامیؒ علیہ الرحمہ آپ کے ہم عصر اور نامور شاعر تھے۔ انہوں نے آپ کو پہلی دفعہ اس حالت میں دیکھا کہ آپ کی سواری جارہی تھی اور آپ کے جلوس میں خدام کی ایک جماعت تھی۔ یہ ظاہری شان و شوکت، اور مال واَسباب اور گھوڑے دیکھ کر مولانا جامیؒ کی شاعری والی حس بیدار ہوئی اور ان کے دلی جذبات اس مصرعے کی صورت میں زبان پر آئے۔

ع : نہ مرداست آں کہ دنیا دوست دارد

یعنی وہ مرد نہیں جو دنیا کو دوست رکھے۔

پھر جب مولانا جامی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ جامی تم نے صرف ایک مصرع کہا ہے، مکمل شعر نہیں کہا۔ دوسرا مصرع بھی کہو۔ مولانا آپ کی باطنی بصیرت دیکھ کر ششدر رہ گئے، اور خاموش رہے۔ چنانچہ حضرت نے خود ہی دوسرا مصرع بناتے ہوئے فرمایا کہ پورا شعر یوں ہونا چاہیے ؎

نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد
اگر دارد برائے دوست دارد

پھر مولانا جامی آپ کے ایسے معتقد ہوئے کہ آپ کے ہی ہو کر رہ گئے۔ آپ کے زیرِ تربیت سلوک کی منزلیں طے کیں، اور آپ کی شان میں ''تحفۃ الاحرار'' کتاب لکھ کر عقیدت کا اظہار کیا۔ (تاریخ مشائخِ نقشبندیہ؛ ص؛320؛از پروفیسر عبدالرسول للہی)

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کی بدولت مختلف قبائل میں اسلام وسیع پیمانے پر پھیلا۔ خاص طور پر ازبک قبائل نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کیا۔ ۲۹؍ربیع الاول ۸۹۵ھ کو شبِ ہفتہ، مغرب اور عشا کے مابین واصل باللہ ہوئے۔ زندگی میں جیسے آپ نے شاہانہ ٹھاٹ باٹ رکھا، پسِ مرگ بھی عقیدت مندوں نے آپ کا مقبرہ نہایت پُرشکوہ اور فلک پیما بنا رکھا ہے۔ سامنے وسیع و عریض مدرسے کا صحن ہے، جس کی دیواروں پر جلی حروف میں مرقوم ہے :

العلم عز الدنیا و شرف الآخرۃ ۔
یعنی علم ہی سے دنیا کی عزت و منزلت اور آخرت کا شرف و وقار ہے۔

دنیاے شریعت و حقیقت کا یہ وہ بادشاہ ہے جس کے روحانی فیضان سے آج عالم اسلام شاداب و نہال ہو رہا ہے۔ رب کریم نے آپ کو مال و دولت کی ایسی فروانی عطا کی تھی کہ آپ کے اونٹ گھوڑے سیم و زر کی کیلوں سے باندھے جاتے تھے؛ لیکن دنیا کبھی آپ کے دل پر حاکم نہ ہو سکی، آپ کا ظاہر و باطن ہمیشہ احکم الحاکمین کے فرمان کے تابع رہا۔ سلاطینِ وقت آپ کی بارگاہ میں حاضری دینے کو اپنے لیے اعزاز تصور کرتے تھے۔ آپ کی دہلیز سے آج بھی شاہانہ جلال ہویدا ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی علیہ الرحمہ کی تربتِ انور پر

پھر ہم امام العقائد والکلام شیخ ابو منصور الماتریدی علیہ الرحمہ کے درِ فیض سے برکت کشید کرنے نکلے۔ ۲۳۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ نے چوں کہ ایک ایسے علاقے میں آنکھ کھولی جو علم و فقہ کی سرگرمیوں سے خوب آباد تھا، خصوصاً امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سلسلے کے علمائے کرام وہاں بکثرت تھے اور اپنی علمی تگ و دو سے پورے علاقے کو روشن کیے ہوئے تھے تو اس ماحول نے آپ کو اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بہترین اساتذہ کی بدولت درجۂ امتیاز عطا کر دیا تھا اور آپ کی علمی کاوشوں نے آگے چل کر ایسی مقبولیت حاصل کی کہ بالعموم علمائے احناف نے عقائد کے مباحث و مسائل اور تحقیقاتی اسلوب میں انہی کی پیروی کی اور یوں علمائے ماتریدیہ اہلِ سنت و جماعت کا ایک علمی ترجمان حلقہ بن کر تاریخی حقیقت بن گیا۔

آپ علومِ قرآن، اصولِ فقہ، علمِ کلام و عقائد کے بے مثال و مستند امام ہیں اور آپ کی پوری زندگی حمایتِ اسلام و نصرتِ عقیدۂ اہلسنت و جماعت سے عبارت ہے، اور آپ بالاتفاق اہلسنت و جماعت کے امام جلیل، محافظ عقائد اہلسنت قرار پائے، معتزلہ اور دیگر فِرقِ ضالہ کا آپ نے اپنے مناظروں اور تصنیفات و تالیفات میں بھرپور رد و تعاقب کیا اور تمام عمر عقائد اہل سنت کی حفاظت و صیانت اور تبلیغ و تشہیر فرمائی۔ آپ کے تلامذہ نے دیار و امصار میں پہنچ کر دین حنیف کی خوب خدمت کی، اور آپ کی تالیفات سے ایک زمانہ فیض یاب ہو رہا ہے۔ ۳۳۲ھ یا ۳۳۳ھ میں راہی ملک بقا ہوئے، اور سمرقند میں تدفین عمل میں آئی۔

آپ کا مقبرہ نہایت خوبصورت اور وسیع دالان و باغات والا ہے۔ مجھے سارے گنبدوں میں سب سے زیادہ سحر خیز اور دل موہ لینے والا گنبد آپ ہی کا لگا، اس کے نقش و نگار بھی جداگانہ تھے اور مقبرے کی تعمیر بھی آپ کے شایانِ شان ہوئی تھی۔

جب آپ کی بارگاہ میں حاضری ہوئی تو رقت کا سماں تھا، اور کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ امام العقائد سیدنا ماتریدی قدس سرہ العزیز کے منہلِ فیض سے کبھی جُرعَہ کشی نصیب ہوگی؛ لیکن قسمت نے خوب یاوری کی اور ہم نے بھی کسبِ فیض میں کوئی کمی روا نہ رکھی۔ ہر زیارت پر زیادہ سے زیادہ وقت دیا، تاکہ صاحبِ مزار کی نسبت سے دل کی ڈور مزید مضبوطی سے بندھ جائے۔

مقبرۂ ابواللیث کی تلاش میں

ازاں بعد ہم امام وفقیہ ابونصر ابواللیث سمرقندی کے مقبرہ کی تلاش میں نکلے؛ کیوں کہ کسی زمانے میں اس پر بڑا شاندار گنبد بنا ہوا تھا؛ لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود اس کا سراغ نہ ملا۔ ممکن ہے کمیونسٹوں نے آپ کے مقبرے کو بلڈوز کر ڈالا ہو۔ بتایا جاتا ہے کہ کمیونسٹوں کے عتاب سے بچانے کے لیے مسلمانوں نے ایسا بھی کیا کہ بہت سے مقابر کے ساتھ مینار و گنبد کو منہدم کرکے عام گھر میں تبدیل کردیا تاکہ ان کی شناخت نہ ہوسکے۔ ممکن ہے فقیہ سمرقندی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہو۔

لیکن پھر بھی میری طبیعت نہ مانی؛ مجھے آپ کی ذات سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا، عقیدت کی ایک وجہ بھی تھی کہ آپ کی شہرۂ آفاق کتاب 'بستان العارفین' کو اُردو کا قالب عطا کیا اور اردو داں طبقے میں اسے بڑی مقبولیت ملی تھی؛ سوچا اپنے ممدوح کی دہلیز تو چوم لوں؛ لیکن افسوس کہ یہ آرزو حسرتِ محض بن کر رہ گئی۔

ہاں! اتنا ہوا کہ جوئندہ یابندہ کے تحت سراغ لگاتے ہوئے ہم ایک گاؤں کے اندر موجود جامع مسجد ابواللیث سمرقندی میں پہنچے، جس کے صحن میں ایک مزار بھی تھا، جب لوحِ مزار پر نظر پڑی تو وہ دراصل فقیہ ابواللیث سمرقندی کے نواسے کا روضہ تھا۔ وہاں کے ذمہ داروں سے جب حضرت فقیہ کی بابت دریافت کیا تو انھوں نے سرد آہ

بھرتے ہوئے کہا کہ یہ سچ ہے کہ فقیہ سمرقندی کے مزار پُر انوار پر کبھی عالی شان گنبد ہوا کرتا تھا؛ لیکن کمیونسٹوں نے جہاں درجنوں کے حساب سے اکابر کے مقابر پامال کیے، انھیں میں ایک آپ کا مقبرہ بھی تھا جسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینک دیا گیا۔

سمرقند و بخارا کا سہاگ کیسے اُجڑا؟

یہیں پر ایک شیخ ملے، میں نے ان سے سمرقند و بخارا کے علمی سہاگ لٹنے اور چمنستانِ علم وکمال کے ویران ہونے کا سبب پوچھا تو انھوں نے جو باتیں بتائیں وہ بڑی سوہانِ روح اور دل و دماغ ماوف کر دینے والی تھیں۔ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ دشمن کس منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی سے کام کرتا ہے، علما کس طرح اس کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں اور سیاسی زوال کا آغاز کس طرح علمی زوال سے ہوتا ہے!۔

اس نے بتایا کہ ترکستانی علاقوں میں علما کی جتنی قدر تھی، شاید ہی کہیں ہو، علما کو لوگ اپنے سروں کا تاج سمجھتے تھے اور ان کی خدمت کو باعثِ سعادتِ دارین جانتے تھے۔ روس کے یہودیوں کو یہی بات بہت کھلتی تھی اور انھوں نے سمرقند و بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے کئی ایک منصوبے بنائے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ پہلے یہاں تاجر بن کر آئے۔ اپنا کاروبار چمکایا، پھر اسی زمین کا حصہ بن کر رہ گئے، خود کو صیغۂ راز میں رکھ کر اپنے بچوں کو منصوبہ بند سازش کے تحت مدرسوں میں تعلیم کے لیے بھیجا۔

یہودی بچے ذہین تو تھے ہی، جلد ہی اساتذہ کی نگاہوں میں اپنی جگہ بنا لیا، دن گزرتا گیا اور وہ عالم وفاضل بن گئے، ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے انھیں متفقہ طور پر مدرسوں میں مدرس رکھ لیا گیا۔ منصبِ تدریس پر فائز ہونے کے بعد یہ دھیرے دھیرے کھلنا شروع ہوئے، علما کو آپس میں دست وگریبان کیا اور ان کی ریشہ

دوانیوں کی وجہ سے اہلِ علم کی آپسی رسی کشی اس حد تک بڑھی کہ علما کی قدر لوگوں کے دلوں سے نکل گئی اور وہ اہل علم سے محبت کی بجائے نفرت کرنے لگے.....۔

جس وقت میں یہ باتیں شیخ کی زبانی سن رہا تھا، ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے وطن ہندستان میں علما کی آپسی آویزش یاد آگئی، اور ان کی سر دو گرم جنگوں کا نقشہ ذہن میں گھوم گیا، جس سے بُرے اَثرات اپنا کام خوب نکال رہے ہیں اور افسوس کہ اس کے عبرتناک نتائج ہمیں مستقبل میں جب دیکھنے کو ملیں گے تو ہمارے پاس نہ جائے رفتن ہوگی نہ پائے ماندن۔ ایسے مایوس کن ماحول میں ہم چھوٹے لوگ بس دعا ہی کرسکتے ہیں کہ خدائے قدوس ہمیں اپنی خیر منانے کی توفیق بخشے اور اس سے پہلے کہ بہت دیر ہوجائے، ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کا شعور عطا فرمائے۔ آمین

اسی کے ساتھ یہ شوشۂ شبہہ بھی دماغ میں اُبھرا کہ کہیں ہمارے مدرسوں میں بھی کچھ ایسے شرپسند عناصر تو نہیں در آئے جو گندم نما جَو فروش ہوں اور ہمارے موقر علما کے درمیان جنگیں کراکے اپنا مادّی مفاد بٹور رہے ہیں؛ کیوں کہ ان جنگوں کا حاصل تو کچھ نہیں، ہاں! اہل علم کا وقار بُری طرح مجروح ہوتا ہے اور عوام کے دل میں رہی سہی علما کی عزت و قدر دانی کا دیا بھی گل ہوجاتا ہے!۔

پھر اس نے بتایا کہ کس طرح انھوں نے علما کو لڑایا، ترکستانی مملکتوں کو ایک دوسرے سے بدظن گیا، سیاسی جنگیں بپا کیں، بدظنی پھیلا کر گھر گھر کو میدانِ جنگ بنایا، خفیہ ایجنسیاں قائم کیں، اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا، لوگوں کی زندگیوں سے اسلام کو نکالا، تعلیم قرآن پر پابندی عائد کی، عربی رسم الخط کو بدلا، خواتین کے سروں سے دوپٹے چھینے، شرم و حیا کا جنازہ نکالا، رقص و موسیقی کو عام کیا، اور معیشت تنگ کرکے شراب و خنزیر کو اتنا اَرزاں کردیا کہ لوگ مارے غربت کے انھیں پینے کھانے پر رضا مند ہوگئے۔ الغرض کمیونسٹوں کی سات دہائیوں پر مشتمل ہمہ جہت تباہ کاریاں

ایسی تھیں کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اللہ ہمیں شعور کی آنکھ کھولنے کی توفیق بخشے، اور سمرقند و بخارا کے علما کے ساتھ ہونے والے ناگفتہ بہ واقعات کا کبھی کسی اور کے ساتھ اعادہ نہ ہو!۔ آمین

میرا اڈرائیور سر پر کھڑا تھا؛ اور صلیب وہلال کی داستان چل رہی تھی، سلسلۂ کلام منقطع کرنے کو تو جی نہیں چاہ رہا تھا؛ لیکن چلتے چلتے میں نے پوچھ لیا کہ شیخ! یہ بتائیں ایسے جاں سوز ماحول اور خطرناک ترین حالات میں پھر دین کی بقا کی ترکیب کیا بنی؟۔

انھوں نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور کہا کہ افراتفری کے اُس ماحول میں کچھ کفن بدوش فرزانے اور جاں بکف علماے دین ایسے تھے کہ جنھوں نے اسلام ومسلمین کی بقا کے لیے ہر ممکنہ حربہ اختیار کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ بہت سے علما اس قدر زیرِ زمین رہ کر کام کرتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکتی تھی کہ تہ خانے میں کیا چل رہا ہے۔ یوں مختلف مکانات اور حجروں میں خفیہ تعلیم دینے کا سلسلہ چلتا رہا۔

کچھ دور اندیش اہلِ علم تو ایسے تھے جنھوں نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے بڑے بڑے ساؤنڈ پروف ہال بنوا دیے تھے، اوراس میں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز مہیا کرا دی تھی، پھر اس کے گرد ایک دوسرے کمرے کا حصار اس انداز سے کراتے کہ شور شرابے کی آواز تو کیا آہِ نفَس بھی باہر نہ جا سکتی تھی۔

استاذ اپنے بچوں کو لے کر جب ہال داخل ہوجاتا تو پھر اس کے دروازے کو لکڑی اور کیلوں کے ذریعہ پکا بند کروا دیا جاتا اوراس کے آگے الماریاں وغیرہ رکھ دی جاتیں، ساتھ ہی شراب کی کچھ بوتلیں اور ننگی تصویریں چھینٹ دی جاتیں تاکہ پولیس کو اگر کہیں سے سراغ مل بھی جائے تو سامنے شیشیاں وغیرہ دیکھ کر وہ سمجھ جائیں کہ یہ تو کمیونسٹوں کا اَڈہ لگ رہا ہے، ان کا دین سے کیا تعلق ہوسکتا ہے!۔ پھر وہ

خوش ہو کر چلے جاتے؛ لیکن انھیں کیا پتا کہ جہاں وہ کھڑے ہیں اس کے چند میٹر کے فاصلے پر احیاے دین کا غلغلہ بپا ہے اور مستقبل کے مجاہدین تیار کیے جا رہے ہیں!۔

پھر وہ بچے کبھی چھ ماہ کے بعد باہر نکلتے، اور کبھی تو حولانِ حول پر وہ باہر کی دنیا کا منہ دیکھ پاتے تھے۔ حالت یہ ہوتی کہ اندر جاتے وقت بچوں کو قرآن کے ایک لفظ کا بھی علم نہیں ہوتا تھا؛ لیکن جب باہر نکلتے تو ان کا ناظرہ مکمل ہو جاتا اور بعض حافظِ قرآن بن چکے ہوتے تھے۔ سبحان اللہ!، سچ ہے کہ

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں جہاں سے
صدیوں رہا ہے کہ دشمن دورِ زماں ہمارا

مقبرۂ محدثین و مفسرین

یہاں سے قریب ہی ایک مقام پر بڑا تاریخی اور منفرد المثال قبرستان ہے، جسے محدثین کا قبرستان کہا جاتا ہے، جس میں قریباً چار سو محمد نامی محدثین و مفسرین آسودۂ خاک ہیں۔ یہاں مدفون ہونے کی دو شرطیں رکھی گئی تھیں: اول یہ کہ وہ اپنے وقت کا مسلمہ محدث و مفسر ہو، دوم یہ کہ اس کے نام کے ساتھ محمد لگا ہو۔ انتظامیہ ان شرائط پر اس سختی سے عمل پیرا تھی کہ جب امام ربانی علامہ مرغینانی صاحب ہدایہ جیسی جلیل القدر شخصیت کا وصال ہوا اور عقیدت مندوں نے اس مقبرے میں تدفین کی اجازت چاہی تو انھیں یہ کہہ کر جگہ نہ دی گئی کہ ان کا نام محمد نہیں ہے!۔

قصہ حضرت دانیال کے مزار کا

یہاں ایک مزار ایسا بھی ہے جو دوسروں سے یکسر مختلف ہے۔ ہر صبح سینکڑوں افراد شہر کے باہر پہاڑی پر موجود عجیب طرز تعمیر کے اس مزار کی زیارت کے لیے

جاتے ہیں۔ یہ مزار پستے اور خوبانی کے درختوں کے درمیان پرانے شہر میں موجود ہے۔ یہاں کی فضائیں چڑیوں کی چہچہاہٹ اور دعا و مناجات کی آوازوں سے معمور رہتی ہیں۔ یہاں آنے والے زائرین میں صرف مسلمان شامل نہیں ہوتے؛ کیوں کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پیغمبر حضرت دانیال کا مزار ہے۔ مقامی زبان میں انھیں دانیار کہا جاتا ہے۔

مسلم، یہودی اور مسیحی سب یہاں آتے ہیں اور اپنے عقائد کے مطابق عبادت کرتے ہیں۔ سینٹ دانیال یہودی تھے؛ لیکن مسلمان انھیں اللہ کا پیغمبر مانتے اور ان کا احترام کرتے ہیں؛ اور وہ من حیث النبوۃ کسی نبی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ غیر معمولی عمارت 20 میٹر سے زیادہ لمبی ہے اور عہد وسطی کے اسلامی طرز میں سینڈ کلر اینٹوں سے بنائی گئی ہے۔ اس میں محراب و گنبد بھی ہیں۔ مزار یا مقبرے میں 18 میٹر لمبی قبر یا تابوت ہے جو گہرے سبز مخمل کے کپڑے سے ڈھکی ہے اور اس پر قرآن کی آیتیں سونے کے حروف میں لکھی ہوئی ہیں۔ ٹھیک مزار کے نیچے ایک میٹھا چشمہ قریباً چھ صدیوں سے رواں دواں ہے؛ لیکن آج تک اس کی جڑ کا سراغ نہ مل سکا۔ لوگ بڑی عقیدت سے پانی پیتے ہیں، بدن پر ملتے ہیں اور تبرکاً اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

ہم نے جب تحقیق کی تو پتا چلا کہ یہ حضرت دانیال کا اصل مزار نہیں ہے؛ کیوں کہ ان سے منسوب فلسطین، مصر اور ایران میں بھی قبروں کے نشانات ملتے ہیں۔ ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ چوں کہ امیر تیمور بڑا صوفی مزاج، علم دوست اور اہل اللہ سے فی سبیل اللہ عقیدت رکھنے والا سلطان تھا تو ممکن ہے ان سے منسوب کوئی چیز یہاں لاکر دفن کردی گئی ہو اور لوگوں نے اسی کو مقبرۂ حضرت دانیال کا نام دے دیا ہے۔ بہر حال!

اس طرح کے بہت سے عجوبے دنیا کے مختلف خطوں میں پائے جاتے ہیں تو اسے دیکھ کر ہمیں کوئی تعجب نہ ہوا۔ زیارت کی، اطراف کا جائزہ لیا اور نکل لیے۔

قصرِ عارفاں تک رسائی

بخارا سے قریباً پچیس کلو میٹر کے فاصلے قصر عارفاں کی پر شکوہ عمارت خندہ زیرِ لب دکھائی دیتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ پہلے اس جگہ کا نام قصر ہندواں تھا؛ لیکن اللہ کے ایک ولی شاہِ بخارا حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کے قدموں کی برکت سے یہ قصر عارفاں بن گیا۔

آپ ۷۱۸ھ میں واردِ جہانِ رنگ و بو ہوئے اور خواجہ محمد بابا سماسی اور سید امیر کلال کی تربیت میں رہ کر علوم و معارف کے جواہر سے مزین ہوئے۔ پھر جب اپنی بساطِ مشیخت بچھائی تو بہت سے شاہبازانِ طریقت آپ کے زیر تربیت رہے، جن میں شیخ عبد الخالق غجدوانی، خواجہ علاء الدین عطار بخاری، عارف ربانی سید شریف جرجانی، خواجہ محمد یعقوب چرخی، خواجہ مسافر خوارزمی اور شیخ سیف الدین ساری وغیرہ مشہور و مشتہر ہوئے۔ ۷۴ سال کی عمر میں بعہد خلافت امیر تیمور گورگانی قصر عارفاں میں سوم ربیع الاول ۷۹۱ھ کو غریقِ رحمتِ الٰہی ہوئے۔

آپ کے لقب ''نقش بند'' کے تعلق سے گوناگوں تحقیقات اور مختلف تاویلات سامنے آئیں؛ لیکن جو بات حقیقت سے زیادہ قریب لگی وہ یہ تھی کہ یہ لقب آپ کو پیشے کے اعتبار سے ملا تھا؛ کیوں کہ آپ کے آبا و اجداد ریشم و کم خواب پر نقش بندی کرتے تھے۔ اور اس سفر ترکستان میں نقشبندی کے کارخانوں کے مشاہدے کے بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔

مدرسہ میرِ عرب کی سطوت

یہیں ایک شہرۂ آفاق جامعہ ''مدرسہ میرِ عرب'' بھی قائم ہے، جو اپنی فلک شگاف عمارتوں کی وجہ سے تاحال شان و شوکت اور اسلامی طمطراق و سطوت کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کے آسمان سے بات کرتے پرشکوہ گیٹ کی پیشانی پر مصطفٰے جانِ رحمت ﷺ کا یہ فرمان مرقوم ہے:

من کان فی طلب العلم کانت الجنة فی طلبهٖ۔
یعنی جو علم کی تلاش میں ہوتا ہے، جنت اس کی تلاش میں ہوتی ہے

یہ مدرسہ اُس مسجد بخاری سے متصل بنایا گیا ہے جس میں امام بخاری درس دیا کرتے تھے۔ توسیع در توسیع کے بعد آج وہ مسجد ایسی عظیم الشان و رفیع البنیان ہوگئی ہے کہ بیک وقت قریباً ایک لاکھ فرزندانِ توحید اپنی جبینِ بندگی خداوندِ قدوس کے آگے جھکا سکتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ خاص بخارا میں کم و بیش ڈھائی سو مدرسے اور ساڑھے تین سو سے زائد مسجدیں آباد تھیں۔ مدتوں یہ سلسلۂ زریں دراز رہا؛ لیکن کمیونسٹوں کی سفاکی و عیاری نے اس چمنستانِ علم و کمال کو بیخ و بن سے اجاڑنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور اپنے زعم کی حد تک اس کے آثار کو ملیا میٹ کر کے اپنے ہاتھ سے مٹی تک جھاڑ لی؛ تاہم اگر نگاہِ حقیقت آگاہ سے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ اجڑے ہوئے سمرقند و بخارا کا علمی دبدبہ و جلال اب تک کسی طرح کم نہیں ہوا اور مشتاقانِ علم و آگہی کو آج بھی دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ستر سال تک یہاں کمیونسٹ سرخ انقلاب کا دار دورہ رہا اور اسلامی تشخص کا سورج پوری طرح گہنایا رہا؛ لیکن ۱۹۹۱ء میں انھیں نعمتِ آزادی میسر آئی اور کمیونزم کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔

اِسلام دشمنی کی اِنتہا

روس کے یہودیوں نے کس حکمتِ عملی، منصوبہ بندی اور دور اندیشی سے سمرقند و بخارا کے علمی چمنستان کو خزاں آشنا کیا، یہ تاریخ کا ایک المناک اور دل دہلا دینے والا سانحہ ہے۔ سولہویں صدی سے قبل یہ سب علاقے مسلمان حاکموں کے تحت آزاد تھے۔ اسی صدی کے نصف میں روسی آمروں نے حملہ کرکے ان پر قبضہ جمایا اور اسلام کا صفایا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ مسلم حکمران بھی اپنے دفاع اور مقابلہ آرائی میں پیچھے نہ رہے۔ قریباً ایک صدی تک یہ طوفانی معرکہ بپا رہا۔ مختلف علاقوں کی آبادی کا خاصا حصہ ملک بدر کیا گیا، قتلِ عام کی وارداتیں بھی ہوئیں، اور ظلم و سفاکی کے پہاڑ بھی توڑے گئے، جس کے سامنے قرونِ وسطی کے واقعات ماند پڑ گئے؛ مگر اصحابِ ہمت و یقین کے ایمان متزلزل نہ ہوئے۔

تنہا شیشان اور الغوش دو صوبوں میں ۲۵ معرکے مسلح اور مضبوط طرز پر مسلمانوں نے کیے، جو صوفیہ و علما کی سرکردگی میں انجام پائے، ان میں تین چوتھائی آبادی کام آگئی، علاقہ کے قصبات و شہر مٹا دیے گئے، کھیت و باغات جلا دیے گئے۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز میں روس میں کمیونسٹ انقلاب ہوا۔ انھوں نے اپنی حکمتِ عملی بدلی، پہلے تو ان لوگوں نے مسلم ریاستوں کو باہمی تنازعات میں پھنسا کر ایک دوسرے سے آزاد کروادیا، اور پھر خود ان سب پر قابض ہو گئے۔ کمیونسٹ قبضہ کے بعد بھی کم ظلم نہیں ہوا بلکہ سفاکی مزید بڑھ گئی، مسجدیں غلہ گوداموں میں، جانوروں کے باڑوں میں تبدیل کر دی گئیں، مدرسے اور شرعی عدالتیں ختم کر دی گئیں، دین پر عمل روک دیا گیا، قرآن مجید کا رکھنا قابل سزا جرم قرار پایا۔

مسلمان علاقوں سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے دور دراز علاقوں میں ملک بدر

کیا گیا، اور ان کی جگہوں پر روسی اور دوسری نسلوں کے غیر مسلم وہاں بسائے گئے، تاکہ آبادی کی خصوصیت ختم ہوجائے یا کم ہوجائے، شہروں اور علاقوں کے نام بدل دیے گئے اور مسلمانوں کو خاندانی اور نسلی بنیاد پر تقسیم کرکے ان کی غیرتوں کو للکارا، پھر جس نے احتجاج کیا اسے دردناک موت کی سزا دی گئی۔

الغرض! اسلام، شعائرِ اسلام، علماے اسلام اور اہلِ اسلام کو مٹانے کے لیے شاید ہی کوئی ایسا حربہ ہو جسے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ تاریخ گواہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام حدیں پھلانگ گئے اور مسلمانوں کو آپس میں دست و گریبان کرکے علمی و سیاسی تمام قوتوں کا جنازہ نکال دیا۔ علما کو بطورِ خاص نشانہ بنایا گیا اور انھیں ہر قسم کے دردناک عذاب سے دوچار کیا گیا، پھر انھیں برسرِ عام شہید کرکے کرینوں کے ذریعہ مٹی کے نیچے دبا دیا گیا۔ بعضوں کو سائبیریا کے برفانی سمندروں میں زندگی کی آخری سانس لینے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

قرآنِ مقدس کی تعلیم پر پابندی عائد کردی گئی، عربی رسم الخط کا استعمال ممنوع ہوگیا، مذہب کو افیون قرار دیا گیا، موسیقی کا چلن عام کردیا گیا، شراب کی نہریں بہادی گئیں، گھر میں چھپ کر شغلِ تعلیم و عبادت جاری رکھنے والوں کے لیے خفیہ ایجنسیاں قائم کی گئیں، اور خانہ تلاشی کے نت نئے طریقے ایجاد ہوئے، الغرض! کمیونسٹوں نے اسلام و مسلمین کے وجود کو ترکستان سے مٹانے کے لیے انسانی و شیطانی تمام طاقتیں جھونک دیں۔

قریباً دو سو سال کے ظلم و سفاکی، ہلاکت و ملک بدری اور مذہب مٹانے کی حرکتوں نے ان علاقوں کے مسلمانوں کے ذہنوں کو طرح طرح کے باطل افکار سے بھر دیا اور اسلام سے ناواقفِ محض بنا کر چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بعض آزاد خیال مسلمانوں سے جب دین و مذہب کی باتیں کی جائیں تو وہ انھیں ایک ذرا نہیں بھاتیں؛ کیوں کہ بھانت بھانت کے توہمات سے ان کے دل و دماغ کو آلودہ کردیا گیا ہے۔

تاہم مجموعی طور پر اشتراکیت کو شکستِ فاش ہوئی ہے اور وہ اپنے منصوبے میں بس وقتی طور پر ہی کامیاب ہو سکی۔ کیوں کہ بہت سے اللہ کے اولوالعزم بندے اور مجاہد صفت افراد ایسے بھی تھے جنھوں نے رات کی تاریکیوں میں اور پہاڑوں کے غاروں میں چھپ کے ٹمٹماتے چراغوں کی روشنی میں دین سے واقف کرانے کی جدو جہد جاری رکھی۔ بہت سے خدامست ان کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہ کر قرآن وحدیث کے انوار نسلوں میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے، اور نت نئے طریقوں سے دینی تعلیم کو جاری رکھتے ہوئے اسلام کی گل ہوتی شمع کو فروزاں رکھا۔

کچھ پکڑے جاتے، شہید کردیے جاتے اور کچھ کام کرلے جاتے۔ اندرونِ خانہ بچوں کو دینی اقدار پر جمائے رکھنے کے سلسلے میں خواتین کے کارنامے بھی بڑے وقیع اور تاریخ ساز ہیں۔ چنانچہ اب جب کمیونسٹ استبداد کا پنجہ ڈھیلا ہوا تو اندازہ ہوا کہ مذہب کو ختم نہیں کیا جا سکا اور اسلام سے اس قوم کا تعلق بھی توڑا نہ جاسکا، اگرچہ آزادی بہت کم مل سکی ہے؛ لیکن بہت تیزی سے مسجدیں تعمیر ہونا شروع ہو گئی ہیں اور ابتدائی مکاتب بھی تیزی سے قائم ہونا شروع ہو گئے ہیں، اور کوشش کرنے والے اپنی اسلامی حالت پر واپس ہونے کی کوشش میں لگے ہیں۔ یہ واقعات ہم اسلامیانِ ہند کے لیے بھی کسی درسِ عبرت سے کم نہیں ہیں۔

یارب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
اِمروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

سیر حاصل

اس پورے سیر وسیاحت میں درجن سے زائد مشاہیر اکابر اور اسلافِ اُمت کے مقابر ومشاہد کی زیارتوں سے ہم بحمداللہ مشرف ہوئے، جو بات خصوصیت سے نوٹ کرنے والی ہے وہ یہ کہ نہ کہیں چادروں کی بھرمار، نہ دیگوں کا طومار، نہ میلے ٹھیلے کا کاروبار، نہ مجاور ومتولی کا بوال اور نہ ہی قوالی ولنگر کا دھمال، ایسا کچھ بھی نہیں، نہایت سنجیدگی کا ماحول، بڑی ہی سادگی کے ساتھ زائرین مقابر پر آتے ہیں اور من چاہے وقت تک پڑھ اور بیٹھ کر چلے جاتے ہیں، نہ انھیں کوئی بلانے والا اور نہ کوئی انھیں بھگانے والا۔ بعض مقامات پر بھیڑ بھاڑ ہونے کے باوجود دھکم پیل کی نوبت نہ آئی؛ کیوں کہ سب کچھ انتظامیہ کے کنڑول میں تھا۔

اہلِ ازبک کی قرآن سے محبت مثالی، دیدنی اور لائق تقلید ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ چھ سات دہائیوں میں انھوں نے جو کچھ کھویا ہے اس کی بازیافت، اپنی کوتاہیوں کے کفارے اور تلافیِ مافات کے لیے جی توڑ کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کے اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

ایک شیخ نے دورانِ گفتگو مجھ سے میرے بچوں کی تعلیم کے حوالے سے پوچھا تو میں نے بتایا کہ بڑی بچی عمر کے سولہویں پڑاؤ پر ہیں، سائڈ سے 12^{th} فائنل کر رہی ہیں، اچھی قاریۂ قرآن ہیں، ترجمہ قرآن بھی نصف ہوچکا ہے، ایک عالمگیر ادارے سے فرض علوم کورس پاس کرچکی ہیں، تجہیز وتکفین کورس بھی مکمل کرکے ان دونوں کورسیز کی خواتین کو ٹریننگ دیتی ہیں اور ہفتہ وار اجتماع بھی کراتی ہیں۔ ساتھ ہی میرے قائم کردہ بچیوں کے ادارہ دارالزہرا للبنات میں اپنی والدہ کے ساتھ درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھاتی ہیں۔ اور بیٹا عمر کی دسویں بہاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پندرہ پارہ حفظ کرچکا ہے۔ ساتھ ہی دینیات وعصریات سے بھی خاصا آشنا ہے۔

یہ سن کر شیخ بہت خوش ہوئے، اور بچوں کو ڈھیر ساری دعاؤں سے نوازا۔ میں نے سمجھا شاید میں نے تربیتِ اولاد میں کوئی بڑا کارنامہ کردیا ہے؛ اس لیے لگے ہاتھوں شیخ کے بچوں کے احوال بھی پوچھ دیے۔ بتایا کہ مولانا! میرا معاملہ بھی آپ کے بچوں جیسا ہی ہے۔ دو بچے ہیں: بڑی بچی کوئی پندرہ سال کی ہوگی جو حفظ مکمل کرکے اس وقت جامع ازہر مصر میں زیر تعلیم ہے۔ بچہ کوئی بارہ سال کا ہوگا، اور اس نے دو سال قبل ہی حفظِ قرآن مکمل کرلیا ہے، اور اس وقت وہ عصریات و دینیات کی تحصیل میں لگا ہوا ہے۔

یہ سن کر مجھے حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ لُٹے پٹے کارواں کے اندر ابھی احساسِ زیاں پورا پورا زندہ ہے۔ میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ اس قوم کو دوبارہ اُٹھنے، اپنی عظمتِ رفتہ کی بازیابی اور ثورۂ اسلامی لانے سے کوئی نہیں روک سکتا!۔ اب ان شاء اللہ مذہب کی روشنی میں علم، اِحساس، زندگی اور حرکت کا چشمہ بہے گا۔ اب پھر آسمان کی بلندیوں کی طرف سفر ہوگا، اور رسولِ گرامی وقار ﷺ کے لائے ہوئے نظام کا سورج طلوع ہوگا۔

اس کا احساس مجھے عام ٹیکسی کے اندر سفر کے دوران بھی بارہا ہوا کہ جب ڈرائیور ایک عالم نما شخص کو دیکھتا تو فرطِ احترام سے بچھ بچھ جاتا۔ پھر جب مترجم کے ذریعہ دین وشریعت کی کچھ باتیں ان سے کرتا تو وہ اشک بار ہوجاتے، ہمہ تن گوش ہوکر ایسے دینی باتین سنتے جیسے انھیں ان کی کوئی متاعِ گمشدہ مل رہی ہو، اور ان سے غفلت کی غنودگی دور ہورہی ہو۔

اس مختصر سی گفتگو کا اَثر یہ ہوتا کہ منزل پر پہنچ کر وہ کرایہ نہ لیتے، ہمارے اِصرار کے بعد بھی وہ انکار ہی کرتے رہتے۔ اگر کسی سے بہت زیادہ ضد کیا تو کہتا بس تیل کا آدھا دے دیں۔ میں ان کی اس علم دوستی، دین شیفتگی اور علما نوازی پر حیران رہ جاتا۔ کئی ایک نے تو قرآن سننے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ پڑھا گیا تو وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کرسکے، اور ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ اُٹھے۔

اہلِ ازبک کی اس کیفیت نے مجھے دورانِ طالب علمی غالباً جماعتِ سادسہ میں بہت زیادہ محنت کر دینے کے باعث ذہنی توازن بگڑ جانے کے ایک واقعے کی یاد تازہ کرادی کہ ہیری ٹیج ہاسپٹل بنارس کے کئی ماہ کے علاج کے بعد جب دماغ کے سارے تار جڑے اور میموری ری اسٹور ہونا شروع ہوئی تو ایک عجیب احساس سے پورا وجود سرشار ہو رہا تھا۔

یوں ہی روسی بھیڑیے، کمیونسٹ سفاک، اسلام و مسلمین کو سینٹرل ایشیا سے ختم کر دینے کا خواب دیکھنے والے اور کئی دہائیوں تک ترکستانیوں کو علمی و اسلامی موت کا مزہ چکھانے والے جب تھک ہار کر بیٹھ گئے، تو مجاہدین و اہلِ ہمت علماے اُمت نے موقع پاتے ہی بھرپور حکمتِ عملی کے تحت شمع اسلام کی پروانہ وار حفاظت کرکے اپنی نسلوں کی رگوں میں ایمان و یقین کی حرارت منتقل کرنے کا بے مثال فریضہ انجام دیا۔ اور اب داعیانِ اسلام اور علماے اُمت جب انھیں دین و عقیدہ کی باتیں بتاتے اور اسلام و قرآن کے دروس یاد کراتے ہیں تو انھیں ایسا لگتا ہے جیسے ان کی میموری ری اسٹور ہو رہی ہو، ان کی غفلتوں کا پردہ چاک ہو رہا ہو اور کمیونزم کا خواب خاک میں مل رہا ہو۔

اس مختصر سے سفر نامے میں بہت سی باتیں میں نے اپنی مجبوری، مسلکی ضرورت اور ملکی مفاد کے پیش نظر قلم انداز کردی ہیں۔ تاہم اہلِ علم و خبر کو اس دیارِ محبت، مدینۃ العلم اور شہرِ شیر دلاں کا رخ کرنا چاہیے۔ یہاں اس وقت تبلیغ اسلام کی تو نہیں کہ یہ غیروں کو کی جاتی ہے اور یہاں سب اپنے ہی ہیں، ہاں ان کے تحسینِ اسلام کی غرض سے اربابِ دعوت و حکمت کو شدِ رحال کرنے کی ضرورت ہے۔

زبان کے مسائل تو واقعتاً بڑے صبر آزما اور پریشان کن ہوتے ہیں؛ تاہم مقصدِ خیر کے تحت ہونے والے اَسفار کے اَسباب از غیب بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ کہا

جاتا ہے کہ علم وفن انسان کو کہیں اکیلا نہیں چھوڑتے، شمعِ علم اپنے گرد پروانے بٹور لیا کرتی ہے۔ اس سفر میں کئی مقامات پر راقم السطور کو اس کا بڑا انوکھا مشاہدہ ہوا۔

اس سفر میں عجب اتفاق ہوا کہ انگریزی، عربی اور فارسی تینوں زبانیں مختلف علاقوں میں اپنی کرشمہ گری دکھاتی رہیں۔ روسی خطہ ہونے کے باعث یہاں ہر شخص روسی زبان جانتا ہے؛ لیکن پھر ریاستوں کی اپنی زبانیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ترکستان وغیرہ میں قزاق زبان کا دار دورہ تھا، وہاں عربی و فارسی ندارد تھی، ڈھونڈے سے بھی کوئی ان زبانوں کا جاننے والا نہ ملا، تو وہاں انگریزی زبان سے کام چلانا پڑا۔ پھر طاشقند میں انگریزی و فارسی کے جانکار نہ دکھے، تو عربی کے توسط سے معاملات انجام پذیر ہوئے۔ جب سمرقند و بخارا پہنچے تو وہاں یقیناً عربی داں رہے ہوں گے؛ تاہم اپنی ساری زیارتیں اور ملاقاتیں فارسی زبان کی رہینِ منت رہیں۔ واقعتاً علم و ہنر کبھی رائیگاں نہیں جاتا، اس کی برکتیں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر مل کے رہتی ہیں۔

یوں تو زندگی میں کئی ملکوں کے بہت سے دعوتی، تعلیمی، تاریخی، اور علمی اَسفار ہوئے؛ لیکن ان کے اَحوال قلم بند کرنے کی طرف کبھی توجہ نہ ہوئی؛ تاہم اس سفر کی بابت کئی احباب نے باصرار فرمائش کی، جن میں محب گرامی مظفر حسنین رومی گورکھ پوری صاحب سر فہرست ہیں؛ اس لیے ''خیالِ خاطرِ احباب'' کے پیش نظر یہ مختصر سا سفر نامچہ سپردِ قرطاس کر دیا ہے؛ ورنہ اپنا حال امام الکلام کے مندرجہ ذیل شعر سے کچھ مختلف نہیں ہے ؎

بس خامۂ خام نوائے رضا، نہ یہ طرز مری نہ یہ رنگ مرا
ارشادِ احبا ناطق تھا، ناچار اس راہ پڑا جانا

کچھ لوگوں کا یہ بھی اِصرار تھا کہ ساتھ میں مزاراتِ مقدسہ اور تاریخی جگھوں کی تصویریں بھی ڈال دی جائیں۔ ظاہر ہے تمام زیارات کی تصاویر ڈالنا سر دست تو ممکن نہیں؛ لیکن جو مشاہیر مقابرِ اکابر اور تاریخی مقامات ہیں، ان میں سے بعض چیدہ تصویریں ضمیمہ کے طور پر شاملِ سفر نامہ کی جا رہی ہیں۔

غرضیکہ مجموعی طور پر یہ ادھورا جزوقتی سفر بڑا دلچسپ، معلوماتی اور برکت آفریں رہا۔ سمرقند و بخارا کے گہوارۂ علم میں گھومنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ خوبصورت و فلک آسا مسجدوں میں نماز پڑھنے کی کیفیت ہی دیگر تھی۔ اور امام بخاری و ماتریدی اور دیگر مقابر و مشاہد پر فاتحہ خوانی کا لطف ہی الگ تھا۔ اربابِ علم و دانش کی محفلوں کی برکتیں ہی کچھ جداگانہ تھیں۔ وقت کی قلت دامن گیر نہ ہوتی اور ٹکٹ میں گنجائش ہوتی تو شاید ان خطوں کو مزید قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا، علما و مشائخ کے خوانِ فضل و کمال سے خوشہ چینی کی جاتی اور بہت سے بچ رہے آستانہ ہائے اکابر واَسلاف سے کسبِ فیض و نور کی سعادت میسر آتی۔

اللہ الکریم عزوجل اس سفر کی برکات و فتوحات سے مجھے، میرے تمام چاہنے والوں اور جملہ برادرانِ ملت کو متمتع و مستفیض فرمائے اور تارِ نفس ٹوٹنے تک خدمتِ دین متین کی توفیق سے ہم سب کو مفتخر فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ و علیٰ آلہ وصحبہ اکرم الصلاۃ وافضل التسلیم

کمالِ سیر کی رعنائیاں بیاں نہ ہوئیں
بہت ہی کام لیا میں نے خوش بیانی سے

محمد افروز قادری چریاکوٹی

۱۸؍ جنوری ۲۰۲۴ء ۔۔۔ ۶؍ رجب المرجب ۱۴۴۵ھ بروز جمعرات

سفر کی کہانی تصویر کی زبانی

شاہ زندہ، سمرقند: عم زادۂ پیغمبر، مبلغ اسلام حضرت سیدنا قثم بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی بارگاہ میں

شیمبولک ، قزاقستان: وسط ایشیا کا پہلا اور دنیا کا تیسرا سب سے بڑا کارٹریک اور اسکیٹنگ پوائنٹ

پیر ترکستان خواجہ احمد یسوی علیہ الرحمہ **کے مقبرہ کا عقبی منظر**

خواجہ احمد یسوی علیہ الرحمۃ و الرضوان کے مقبرہ کا صدر دروازہ

یونیورسٹی، ترکستان: خواجہ احمد یسوی کے رحاب میں واقع عظیم الشان ٹوریزم یونیورسٹی

کوکلداش مدرسہ، طاشقند

حضرت کامپلیکس، طاشقند

خواجہ عبید اللہ احرار مسجد کا عقبی منظر مع قرآن کمپلیکس

قرآن کمپلکس میں رکھا مصحفِ عثمانی کا قدیم وتاریخی نسخہ

شاہ زندہ، سمرقند: حضرت قثم بن عباس ؓ اور دیگر اکابر و مشائخِ سمرقند کے مقابر و مشاہد

مقبرۂ صدر اول ازبیکستان‘ اسلام کریموف مع مسجد خضر علیہ السلام

گورِ امیر، سمرقند: جہاں سلطان تیمور اپنے خاندان کے چیدہ افراد کے ساتھ پیوندِ خاک ہے۔

امیر تیمور کی اہلیہ بی بی خانم کی یاد میں بنی عجوبۂ روزگار مسجد

مقبرۂ امام بخاری، خرتنگ: اس کی توسیع کا کام جاری ہے اور بخاری کا مپلیکس تیار ہو رہا ہے

مقبرۂ امام العقائد والکلام حضرت ابومنصور ماتریدی علیہ الرحمہ